ضمیمہ کتاب انگریزی "ماڈرن اُردو پوئٹری"
مصنفہ موہن سنگھ دیوانہ

# منتخباتِ نظمِ اُردو

(۱۸۶۷ - ۱۹۲۵ء)

جس میں

۴۷ برگزیدہ شعرا (۱۹ ہندو، ۲ عیسائی، ۲۶ مسلمان) کا
اُن کی ذات وصفات شاعری کی صحیح نمائندگی اور ترجمانی
کرنے والا کلام جمع کیا گیا ہے۔ تاکہ حالیہ اُردو شاعری
خصوصیات ورجحانات کا پورا پورا اندازہ ہو سکے۔

مؤلفہ

موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے (کلکتہ) لکچرار اورینٹل کالج لاہور

لاہور

پہلا ایڈیشن

قیمت [illegible]

(لاہور آرٹ پریس لاہور)

# فہرست

# بشن نرائن در ابرؔ لکھنوی

## فراق۱؎

کوکلا تجھ سے طبیعت جو بہل جاتی ہے
اپنا دُکھ تجھ کو سناؤں ہیں بہن تو جو سُنے
پیا پردیس گئے جب سے کچھ ایسے چُپ ہیں
نہیں معلوم کہ کیا اُن پہ گذرتی ہوگی
ساس سے کچھ نہیں کہہ سکتی نہ کچھ دیور سے
پوچھوں کس سے میں بہن اُسکا تو یہ حال ہے اب
مجھ کو دیوانہ بنا رکھا ہے سب نے گھر میں
تیری ماں بھی یہ میری ساس سے کل کہتی تھی
مُنہ لپیٹے ہوئے ہر وقت پڑی رہتی ہے
ساس بولیں کہ بناوٹ کی ہیں ساری باتیں
یہی سُن سُن کے کُڑھا کرتی ہوں دن رات بہن
اپنا دُکھڑا میں کہوں تجھ کو کہاں تک پیاری
تو یہ کہتی ہے کہ اب آتے ہیں آتے ہیں پیا
تو ذرا کہہ تو کہ اک نار جدائی سہتی ہیں

تو جو آئی تو میرے دل میں یہ لہر آتی ہے
صبح سے آج طبیعت مری گھبراتی ہے
نہ تو خط آتا ہے کوئی خبر آتی ہے
اُنکا دھیان آتا ہے تب جان پہ بنجاتی ہے
مجھے تو نند سے بھی پوچھتے شرم آتی ہے
سیدھی سی بات جو کرتی ہوں بگڑ جاتی ہے
میں جو روتی ہوں تو لوگوں کو ہنسی آتی ہے
کونسا غم ہے بہو کو جو گھُلی جاتی ہے
سُست رہتی ہے نہ بیٹھی ہے نہ کچھ کھاتی ہے
ہیکے جانے کیلئے سو رنگ یہ چُھپاتی ہے
کیا کروں موت بھی تو مجھ کو نہیں آتی ہے
تو جو آتی ہے طبیعت یہ بہل جاتی ہے
جلتی رہ میری بہن کیا مجھے بہلاتی ہے
مجھ کو تو ساس سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے

۱؎ ادیب - الہ آباد - نومبر ۱۹۱۱ء - صفحہ ۲۴۱

پھر میری بات پہ کیا جانے وہ کیا کہتے ہیں — طعنہ بازی سے طبیعت مری گھبراتی ہے
ساس نندوں کی محبت کو تو میں دیکھ چکی — آگے کیا دیکھئے قسمت مری دکھلاتی ہے
دھک سے رہ جاتی ہوں سنتی ہوں جو پردیس کا نام — ایک اداسی سی مرے چہرے پہ چھا جاتی ہے
دل بھر آتا ہے مرا غیر کا ذکر سنتے — سچ کی بات نہیں مجھ سے سہی جاتی ہے
آنکھ لگتے ہی برے خواب نظر آتے ہیں — بند کانوں میں بھی رونے کی صدا آتی ہے
ایسی کمزور طبیعت ہوئی ہے ان روز دل — ہر طرف تیری ہی شکل نظر آتی ہے
کو کھلا رہے وسوسوں کا تو یہ عالم ہے — کل کی بات آج جو پوچھو نہیں یاد آتی ہے
اپنے سایہ سے بھی ڈرتی ہوں اکیلے میں بہت — گھر کی بھی شکل بھیانک سی نظر آتی ہے
بیکسی پر جو میری اس کو ترس آتا ہے — کبھی دو چار گھڑی ساس بھی سمجھاتی ہے
میرا دیور بھی تسلی کبھی کرتا ہے مری — نند بھی میری دلاسا مجھے دے جاتی ہے
کیا کہوں دل میری طبیعت بھی ہے ایسی کمبخت — کچھ جتن کیجئے پر یہ نہیں کل پاتی ہے
دن تو رو رو کے کسی طرح سے کٹ جاتا ہے — چھاتی پھٹتی ہے مری رات جہاں آتی ہے
شام سے صبح تلک تارے گنا کرتی ہوں — بیٹھے چین آتا نہ لیٹے مجھے نیند آتی ہے
تھرتھرا جاتی ہوں گھبرا کے میں جو ناگہ اٹھتی ہوں — سنسنی یاد کی جو سوتے میں سرک جاتی ہے
دھیان رہتا ہے پیا کا مجھے دن رات بہت — تیری پیاری تو اسی غم میں گھلی جاتی ہے
نہیں معلوم کہاں ہونگے وہ کیسے ہونگے — سوچ انہیں کا ہے انہیں کی مجھے یاد آتی ہے
یاد پردیس میں مجھ کو وہ بھی کرتے ہونگے — کچھ سبب ہے جو طبیعت مری گھبراتی ہے
آنکھ لگتے تو کسی آس کا آسرا کیسے کی — تھوڑی سی فرحت سو غم میں کٹی جاتی ہے
میرے گھر والے تو ناداں سمجھتے ہیں مجھے — پھر تسکین کو تو بھی مجھے پھسلاتی ہے
آکے تو کہتی ہے چلو باغ میں جھولا جھولیں — رت ہے ساون کی جو گھنگھور گھٹا آتی ہے
صدقے جاؤں میں تیرے پیار محبت کے بہن — تو کس طرح سے دل کو مرے بہلاتی ہے

پر میرا حال جو کچھ ہے وہ کہوں کیا تجھ سے
مجھے دنیا کی کوئی بات نہیں بھاتی ہے
ضعفِ غم سے یہ ہوا حال کہ اب نبض مری
چھوٹ جاتی ہے تو گھڑیوں نہیں پھر آتی ہے
دل تڑپ جاتا ہے پھٹ جاتی ہے چھاتی میری
روتی ہوں شعر کسی کا جو یہ تو گاتی ہے
شکلِ اُمید تو کب ہم کو نظر آتی ہے
صورتِ یاس بھی بن بن کے بگڑ جاتی ہے

# ارشد حسین تھانوی

## جذباتِ ارشد

بستی سے تھا دور ایک فراموشی کا عالم
اور تاروں بھری رات کی خاموشی کا عالم
چھائے ہوئے جنگل میں سب آثارِ سکوں تھے
اشجار بھی صحرا کے پرستارِ سکوں تھے
اک گھاس کی پتی کو بھی حرکت نہ ذرا تھی
سناٹا سا کچھ ایسا تھا کہ مسحور ہوا تھی
اک امنِ حقیقی تھا کہ تھا ساریِ صحرا
تھا خواب نما عالمِ بیداریِ صحرا
چپ چاپ یہ منظورۂ نظارگیاں تھا
اندازِ سکوتِ دلِ شاعر کا گماں تھا
کچھ دیر میں اک اور ہی نقشہ نظر آیا
مہتاب کے انوار کا جلوہ نظر آیا
تاریکیِ زریں کہ تھی ممنونِ کواکب
منت کشِ ضیا تھے گلگونِ کواکب
بچپن سے جوانی ہوئی اک شوخ حسین کی
بالکیت کیا چاند نے وسعت پہ زمیں کی
سینۂ سیال میں رقصاں تھیں شعاعیں
گویا ارمِ نور کی پریاں تھیں شعاعیں
تابانیاں حصہ میں جو آئی تھیں زمیں کے
ذرات بھی افشاں تھے کسی ماہ جبیں کے
وہیں کہ نظر آتا ہوں اک پیکرِ خاموش
سینہ میں لئے پھرتا ہوں صد محشرِ خاموش

اس ظلمتِ ہستی سے ہراساں نہیں ہوتا
آزردہ و حیران و پریشاں نہیں ہوتا

ملتا جو نہیں کوئی شناسائے حقیقت
کرتا ہوں شکیبائی سے اخفائے حقیقت

دل کو مگر اپنے کبھی گھٹنے نہیں دیتا
اس جنسِ گراں مایہ کو لٹنے نہیں دیتا

مایوسیوں میں شوق مرا راہنما ہے
تاریکیِ مطلق میں ستاروں کی ضیا ہے

احساسِ سیاہ بختی سے پُرغم نہیں ہوتا
حسرت کشِ ناکامیِ پیہم نہیں ہوتا

اُمید کو رکھتا ہوں چراغِ رہِ مقصود
رہتی ہے مرے سامنے منزل گہِ مقصود

ہے منتظرِ جانِ جہاں زندگیِ عشق
بے تابِ مہِ حسن ہے تابندگیِ عشق

اُس جلوۂ پنہاں کے مظاہر ہیں نظر میں
مستقبلِ رخشاں کے مناظر ہیں نظر میں

حاصل مجھے ہر وقت طمانیتِ دل ہے
جس میں کوئی حارج ہے مرا در نہ مخل ہے

# محمد حسین آزاد دہلوی

## ابرِ کرم[1]

جو نکتہ یاب ہیں کتبِ انقلاب کے
دن رات کو سمجھتے ورق ہیں کتاب کے

دفتر ہے اُن کے سامنے ماضی و حال کا
جو آگے آئینہ ہے دکھاتا مثال کا

روشن سب اُس میں عہدِ بعید و قریب ہیں
تماشائے عالم کے مرقع عجیب ہیں

آتی ہے دمبدم نئی تصویر سامنے
تحریرِ تازہ لاتی ہے تقدیر سامنے

اس کشورِ فنا کا عجب طرز و طور ہے
دم بھر میں صورت اور ہے دم بھر میں اور ہے

قانونِ انقلاب یہاں رسم و راہ ہے
موسم بموسم اُس میں نیا بادشاہ ہے

[1] مجموعۂ نظمِ آزاد۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور ۱۸۹۹ء صفحہ ۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹

اب ہاں جو چند روز سے جاری نظام تھا
گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام تھا

عالم تھا شعلہ خیز و فلک شعلہ ریز تھا
اک حکم تھا جو گرم تو اک حکم تیز تھا

منہ پر زمیں کے دیکھو تو ہے خاک اُڑ رہی
اور گرد چار سو تہِ افلاک اُڑ رہی

دنیا میں بوند بوند کو خلقت ترس رہی
پانی کی جائے آگ فلک سے برس رہی

شہروں میں سوکھ سوکھ کے جنگل چمن ہوئے
اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے

طفلِ نباتات پیاس کے مارے بلک رہے
خلقِ خدا کے نالے بہت دور تک گئے

سیماب ہو کے سینے سے ہر دل نکل چلا
اور آفتاب شمع کی صورت پگھل چلا

دل تشنگی کے مارے یہ بیتاب ہو گئے
انسان تڑپ کے ماہیِ بے آب ہو گئے

پر اب ہے دور دورِ شہِ برشکال کا
چھایا فلک پہ ابر ہے جاہ و جلال کا

گرمی کا جو بخار تھا سارا نکل گیا
اور رنگ آسمان و زمیں کا بدل گیا۔

فرمانِ راحتِ سحر و شام آ گیا
خلقِ خدا کی جان کو آرام آ گیا

اے ابر آ کہ تو تو شہِ برشکال ہے
جو خشک وتر ہے تیرے کرم سے نہال ہے

تیرے عمل کے واسطے رنگِ جہاں ہے اور
تیری زمیں ہے اور تیرا آسماں ہے اور

نوروزِ آب و رنگِ بہارِ جہان ہے
تو نو بہارِ کشورِ ہندوستان ہے

اے ابر جوشِ سبزہ و گلبن نہیں ہے یہ
پھولی نہیں سماتی خوشی سے زمین ہے یہ

مدت سے انتظار تھا تیرا جہان کو
آنکھیں سبھوں کی لگ گئی تھیں آسمان کو

آنے سے تیرے آ گیا آنکھوں میں نور ہے
دیوار و در سے آج برستا سرور ہے

تیرے ہی دم قدم کی یہ سب لہر بہر ہے
سیراب کوہ و دشت تو شاداب شہر ہے

ہر قطرہ تیرا قطرۂ آبِ حیات کا
پانا حیات تجھ سے ہے عالم نبات کا

تو دودھ ہے نباتات کے اطفال کیلئے
اور زندگی درختِ کہن سال کیلئے

اے ابر زور کیا کھوں میں تیرے شیر کے
دانہ پہاڑ کو سے نکل آتا چیر کے

سب تجھ سے نونہالِ چمن سبز بخت ہیں
اور میووں سے بھرے ہوئے دامن درخت ہیں

یہ پھول پھل نہیں ہیں برابر نکل پڑے
ہیں جو صلے بہار کے باہر نکل پڑے

گہ پرنیانِ سبز اڑھاتا زمیں کو ہے
پھولوں سے گاہ کرتا شگفتہ جبیں کو ہے

گردوں پہ کرتا عالمِ نیرنگ ہے کبھی
دکھلاتا ایک رنگ میں سو رنگ ہے کبھی

سیمابِ صبح میں کبھی شنگرف کا گھولنا
اور وہ نگار خانۂ چینی کا کھولنا

لانا کبھی کچھ اور ہی جوش و خروش ہے
کرتا فلک کو بادلوں سے دگلہ پوش ہے

یوں رنگ دمبدم جو بدلتا جہاں کے ہے
اے ابر کبھی شعبدہ بازی کہاں سے ہے

اے ابر جب تو آتا ہے میدان پہ اوج کے
دل بادل آگے پیچھے لئے ساتھ فوج کے

آتا ہے دیوزاد کی صورت بنا کے تو
اور بال و پر نمد کے ہے اڑتا لگا کے تو

اس وقت تیرے رعد کی آواز ہے غضب
اے ابر تیرے ساتھ یہ دمساز ہے غضب

بل بے تیری گرج کہ دل زار ہل گئے
ہیبت سے رعد و برق کے کہسار ہل گئے

لیکن جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں آ رہیں
اور ڈھیبدل کے سازوں پہ سُر ہیں ملا رہیں

کوئل کی کوک اور پپیہے کا بولنا
اور میٹھی بولیوں میں وہ شربت کا گھولنا

اے ابر سب یہ ساز و نوا تیرے دم سے ہیں
یہ لطفِ عیش و لطفِ ہوا تیرے دم سے ہیں

غنچوں کے مارے پیاس کے تھے منہ کھلے ہوئے
گلشن کے نونہالوں کے منکے ڈھلے ہوئے

انسان پھرتے پیاس سے تھے بدحواس سے
منہ کھولے تھے کبوتر و کنجشک پیاس سے

رونق سبھوں کے منہ پہ اس آن آ گئی
آنے سے تیرے جان میں ہے جان آ گئی

تیرا خطاب رحمتِ پروردگار ہے
خلقِ خدا کے رزق کا تو ذمہ وار ہے

سرمایہ تو ہی دیتا ہے تجار کے لئے
اور سایۂ ہما ہے زمیندار کے لئے

اے ابر وہ جو خلق میں دہقانِ پیر ہیں
عمریں ہوئیں لکیر پہ بیٹھے فقیر ہیں

ان کو امید تھی نہ کسی کی پناہ تھی
تجھ پر نظر تھی یا کہ خدا پر نگاہ تھی

آج اپنے رنج و فکر سے اُن کو فراغ ہیں
ہیں بیٹھے اپنے کھیتوں پہ اور باغ باغ ہیں

اے ابر تیرے فضل کا ہر جا وفور ہے
ہر کوہ و کوہسار میں کچھ اور نور ہے

ہیں سب پہاڑ پھولوں سے دامن بھرے کھڑے
اور گلبنوں سے لے کے شجر تک ہرے کھڑے

چشمے ہیں جابجا تری رحمت کے بہ رہے
گویا زبانِ موج سے ہیں وصف کہہ رہے

ریتی پہ خشک لب تھا جو دریا پڑا ہوا
ہو جیسے کوئی سانپ سسکتا پڑا ہوا

اب پوچھتا فلک سے ہے مقدار اوج کی
دیکھو ہیں آیا توڑ کے زنجیریں موج کی

دیوانہ وار کف بہ لب آب مارتا
گاہے تھپیڑے ہے گہے گرداب مارتا

یہ جوش یہ خروش سماں ہے دکھا رہا
ہر موج میں ہے نوح کا طوفاں اٹھا رہا

پر مجھ کو رشک ہے اُسی مستِ مدام پر
جس کی کہ مے کشی نہیں موقوف جام پر

مستانہ پن میں رکھتا ہے دیوانہ طور بھی
مستانے ساتھ رکھتا ہے دو چار اور بھی

سبزہ پہ لوٹتا ہے دماغ آسماں پہ ہے
اور دمبدم یہ مطلعِ موزوں زباں پہ ہے

یوں پھوٹ کر جو ہیں گل و ریحان نکل پڑے
کیا جانے کن دلوں کے ہیں ارمان نکل پڑے

اے ابر تو تو چھایا ہوا ہے جہان پر
چھایا ہوا سماں ہے زمین آسمان پر

چلنا وہ بادلوں کا زمیں چوم چوم کر
اور اُٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر

بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی
سبزے کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی

آتی اِدھر صبا ہے اُدھر سے نسیم بھی
اور اُن کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی

مستی میں جھومنا وہ جوانانِ باغ کا
جھک جھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا

سبزے کے عکس سے در و دیوار سبز سبز
سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز

ان سبز سبز کیاریوں پر دل ہیں لوٹتے
طوطی برنگِ طائرِ بسمل ہیں لوٹتے

شبنم عجب بہار ہے اپنی دکھا رہی
موتی بکھیرتی ہے جواہر لٹا رہی

سبزے کے برگ برگ میں موتی جڑے ہوئے
شاخ و شجر تمام مرصّع کھڑے ہوئے

پتوں پہ جب تلک ہیں تو صیقل نگار ہیں
شبنم کا جوش گر یہی طوفاں اُٹھائے گا
لو بادل اب گرجتے ہوئے سر پہ آ گئے
کیا مست آیا جھوم کے سرشار ابر ہے
آیا اُمنڈ گھمنڈ کے عجب دھوم دھڑکا رہے
لیکن یہ پیاچرا سا برستا پھوار کا
بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں
وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلکتے ہیں
آبِ رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے
جل تھل ہیں کوہ و دشت ہیں نالے آب کے
ہر جا پہ طائرانِ چمن غول غول ہیں
کوئل کا دور دور درختوں میں بولنا
طاؤس کا وہ دم کو چھتر کر کے ناچنا
لیکن چمن سے ناچ کے چلتا جو مور ہے
املی کے اک درخت میں جھولا پڑا ہوا
جھولوں میں نوجوان ہیں بلنگیں چڑھا رہے
ساون کے گیت اُٹھاتے طوفاں ڈولتیں ہیں
ہر تان میں ملہار کے مستی کا شور ہے
اے ابر تیری رات کی تعریف گر کروں
کیا کیا بیاں کروں میں تری رات کا مزا

ٹپکے اگر ہوا سے تو ہیرے کا ہار ہیں
ہیرا چمن کی اوس پہ الماس کھائیگا
اور شامیانے شرق سے تا غرب چھا گئے
برسے گا آج خوب دھواں دھار ابر ہے
نو دن کی گر لگا دے جھڑی تو بہار ہے
ہیرے گا پیام ابر بہاری کی نار کا
اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں
وہ کیاریاں بھری ہوئیں تھالے چھلک رہے
اور روئے سبزہ زار کا دھو کر سنوارنا
اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے
گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے
آپس میں بول بول کے کرتے کلول ہیں
اور دل میں اہلِ درد کے نشتر گھنگولنا
اور مورنی کا اشک کے موتی کو جانچنا
اک قہقہہ یہ طنز لگاتا چکور ہے
اور ساتھ اس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا
اور نیچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے
پردیسیوں کی یادوں سے ارماں دلوں میں ہیں
بادل گرج کے پردے میں دنیا ٹکور رہے
لازم ہے پہلے میں رہِ ظلمات سر کروں
گر رات کا مزا ہے تو برسات کا مزا

سنسان رات اور وہ آئی ہوئی گھٹا
چاروں طرف جہان میں چھائی ہوئی گھٹا

بجلی کبھی نگاہِ فتنہ ساز سے
کرتی نقاب ابر میں چشمک ہے ناز سے

اور کوکنا پپیہے کا وہ دل کی ہوک سے
نالے کو اپنے تولنا کوئل کی کوک سے

کوٹھے پہ ٹھنڈے ٹھنڈے بچھونے وہ اوس میں
ہے گل کو فخر آئے اگر پائے بوس میں

آنا وہ بھیگی بھیگی ہوا کا کبھی کبھی
بول اٹھنا مرغِ نغمہ سرا کا کبھی کبھی

آرام کہہ رہا ہے کہ میرے ہی ہو رہو
قسمیں ہے دیتی نیند کہ بس اب تو سو رہو

آزاد لکھتے لکھتے ہی آدھی تو ڈھل گئی
اور شمع لالٹین میں ساری پگھل گئی

طولِ امل کو اپنے اب انجام دیجیے
کوئی گھڑی تو آپ بھی آرام کیجیے

## محمد اسمٰعیل میرٹھی

مقصود زیارت ہے اگر کعبۂ دل کی
ہو گرمِ سفر ناحیۂ ملکِ وطن میں

شورش میری بیجا ہے نہ فریاد نکمی
رونق ہے ذرا نالۂ بلبل سے چمن میں

تاثیر ہو کیا خاک جو باتوں میں گھڑت ہو
کچھ بات نکلتی ہے تو بے ساختہ پن میں

کمتر ہے دو و دام سے انساں بمراتب
ہر دم جو ترقی نہ کرے چال چلن میں

ہوں میں تو وہی معتکفِ گوشۂ عزلت
حالانکہ میرا رخت پہنچا ہے دکن میں

صـ ۲۵۵

---

یاد اور امید کی دولت سے کٹ جاتے ہیں دن
ورنہ غم کیا ہے دنیا میں گذر ہوتا نہیں

ہے شعورِ ماسوا بھی اک حجابِ آگہی
سینہ غم جب تنگ سا ہو لے باخبر ہوتا نہیں

صـ ۲۱۲

کلیاتِ اسمٰعیل ۱۹۱۰ء میرٹھ

سنتے کبوتر ہیں جب پارۂ مُرغِ گرسنہ
بکثرت ہیں دام اور دانے بہت ہیں
صفحہ ۳۵۱۸

---

جن کو عنایتِ ازلی سے ہے چشم داشت
وہ معتقدِ دعا کے نہ قائل دوا کے ہیں
اپنے وجود کا ابھی عقدہ کھلا نہیں
مصروف حل و عقد میں ارض و سما کے ہیں
صفحہ ۲۵۸

---

سب جانتے تجھ میں ہیں پانو سب پایا سب میں ہے
اس پہیلی کو کسی نے آج تک بوجھا نہیں
صفحہ ۲۶۲

---

وہ حسنِ لازوال ہماری نظر میں ہے
شانِ کمال صورتِ ہر خیر و شر میں ہے
بتلا دیا ہے راہ نما نے مجھے پتا
دنیا بھی اک مقام تیرے رہگذر میں ہے
صفحہ ۲۷۲

---

ہر حسنِ خود نما سے زبان و زمین ہے
زاہد ہنوز منتظر حورِ عین سے ہے
تیرے سوا اسے نظر آتا نہیں کوئی
حاصل جہان میں جسے عین الیقین ہے
صفحہ ۲۷۳

---

کچھ ایسے دلفریب شگوفے کھلا گئے
مشقِ خیال سے نہ بنی دل جدا کئے
دریا تو ہے وہی جو ہوا داخلِ محیط
وادی ہیں ورنہ سینکڑوں نالے بہا گئے
ابنائے روزگار میں ایسا بھی کوئی ہے
جس نے حقوقِ صحبتِ یاراں ادا کئے
انسان کی زمام ہے خصلت کے ہاتھ میں
اہلِ جفا کو چین کہاں بے جفا کئے
صفحہ ۲۷۶

---

کیا بات ہے گر کیا ترحم
ہیہات جو تو نے داوری کی
دیکھا تو وہی ہے راہ و رہرو
پھر اس نے ہی آپ راہبری کی
صفحہ ۲۷۷

عالم کے صحیفہ میں یہ قدرت کی نگارش
دیکھو گے تو ہر نکتہ پہ تم صاد کرو گے ص۱۲

---

خارج ہے عہدِ طفلی و پیری حساب سے
البتہ زندگی ہے عبارت شباب سے

بے نورِ سینہ حفظِ سفینہ سے فائدہ
معنی سے ہے کتاب نہ معنی کتاب سے

وہ اور ہی نوا ہے محرک سرور کی
باہر گلوے مطرب و تارِ رباب سے

ہے دعوے خلوص تو کانوں پہ ہاتھ رکھ
بیم عذاب اور امیدِ ثواب سے

کیا کہئے آدمی کے عجب چیز ہیں جناب
برتر ملائکہ سے فروتر دواب سے

سوجھیں وہ بدعتیں کہ خدایا تیری پناہ
فرصت اگر ملے بھی ہمیں خورد و خواب سے ص۲۷۰

---

# اکبر حسین اکبر الہ آبادی

ہستی[۱] کے شجر میں جو یہ چاہو کہ چمک جاؤ
کچے نہ رہو بلکہ کسی رنگ میں پک جاؤ

میں نے کہا قائل میں تصوف کا نہیں ہوں
کہنے لگے اس بزم میں آؤ تو تھرک جاؤ

میں نے کہا کچھ خوف کلکٹر کا نہیں ہے
کہنے لگے آجائیں ابھی وہ تو دبک جاؤ

میں نے کہا ورزش کی کوئی حد بھی ہے آخر
کہنے لگے بس اس کی یہی حد ہے کہ تھک جاؤ

میں نے کہا افکار سے پیچھا نہیں چھٹتا
کہنے لگے تم جانبِ مے خانہ لپک جاؤ

میں نے کہا اکبر میں کوئی رنگ نہیں ہے
کہنے لگے شعر اس کے جو سن لو تو پھڑک جاؤ

---

۱؎ کلیاتِ اکبر حصہ اول۔ ایڈیشن پنجم۔ جنوری ۱۹۱۸ء الہ آباد صفحہ ۱۸۴

# برقِ کلیسا[۱]

رات اُس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حُسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ اُبھار

زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مُرید
قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں

گرم تقریر جسے سُننے کو شعلہ لپکے
دلکش آواز کہ سُن کر جسے بُلبل جھپکے

دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جُھک جائیں

آتشِ حسن سے تقویٰ کو جلانے والی
بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی

پہلوئے حُسنِ بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق
تُرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

بس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی
سُر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

ضبط کے عزم کا اُس وقت اثر کچھ نہ ہُوا
یاحفیظ، کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہُوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں مَیں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے
بُوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کُودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائے کوئی میداں میں تو اترا جائیں
پائیں سامانِ اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی

۱؎ ولہ صفحہ ۱۷۲ - ۱۷۳

عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح

شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہے براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

ہاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہرِ تیغِ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نورِ ایماں کا ترے آئینۂ رو پہ نثار

اُٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
ہاں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی ماضی سمجھو

---

[۱] اک فلسفہ ہے تیغ کا اور اک سکوت کا
باقی جو ہے وہ تار ہے بس عنکبوت کا

باہم شبِ وصال غلط فہمیاں ہوئیں
مجھ کو پری کا شبہ ہوا اُن کو بھوت کا

---

[۲] اُٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یادِ خدا کریں گے
معاً مگر یہ خیال آیا ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے

کہاں کے قبلہ کہاں کے قبلی جنید کیسے کہاں کے شبلی
عوض تصوف کے ہم نے طب لی بنیں گے سرجن مزا کریں گے

---

[۱] ولہ صفحہ ۲۱۱ - ۲۱۲ [۲] ولہ ص ۲۵۳

# محمد اقبال ۔ اقبال

## غزل[۱]

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کونسی بستی کے یا رب رہنے والے ہیں

علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

بیابانوں میں اے دل اہلِ دل کی جستجو کیسی
کریں جو پیار انساں سے وہی اللہ والے ہیں

پھلا پھولا رہے یا رب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

غضب کے من چلے ہیں جنسِ دل کے بیچنے والے
یہ سودے مال کیساتھ آپ بھی بک جانے والے ہیں

رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے نالے ہیں

پتہ یوں تو بتاتے ہیں وہ سب کو لامکاں اپنا
ہمیں معلوم ہے اے دل جہاں کے رہنے والے ہیں

پلا دی اس کو کیا مے ساقیِ بادِ بہاری نے
زبانِ برگِ گل پر قطرۂ شبنم کے نالے ہیں

نہ دیکھ اے دیدۂ خونبار دل کو کم نگاہی سے
تیرے آنسو اسی اجڑے ہوئے گلشن کے لالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد ہونے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

دعا دیتا ہوں روتا ہوں گلہ کرتا ہوں قسمت کا
ہزاروں ڈھنگ اظہارِ تمنا کے نکالے ہیں

الٰہی کونسا مالی ہے اس دل کے گلستاں کا
امیدوں کے شجر زخموں کے گل داغوں کے لالے ہیں

امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

نشانِ ماہِ کنعاں اے زلیخا پوچھ لے مجھ سے
کہ میں نے چاہِ دل سے سینکڑوں یوسف نکالے ہیں

نہیں کچھ امتیازِ ما و تو شہرِ محبت میں
نرالا دیس ہے دستور بھی یاں کے نرالے ہیں

---

۱؎ ادیب ۔ الٰہ آباد ۔ جون ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۹۴ ۔ بانگِ درا کریمی پریس لاہور ۔ صفحہ ۱۰۳ ۔ ۱۰۴

ترے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

## فلسفۂ غم[۱]

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی
موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی
ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گُل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بُلبل وہ بُلبل ہی نہیں
آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
روح کا سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کیلئے گردِ ملال
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے
طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انسان کا دل غم انکشافِ راز ہے
غم نہیں غم، رُوح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے
شام جس کی آشنائے نالۂ یارب نہیں
جلوہ پیرا جسکی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا
ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دُور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے
اے کہ نظمِ دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے

---

۱؎ ادیب الہ آباد جون [illegible] صفحہ ۲۹۲

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے
رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم نا آشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اسکا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

پستیِ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو
دامنِ دل بن گیا ہو رزمگاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر
خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہوا اور خاموش آوازِ ضمیر
وادیِ ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

# محمد مرتضیٰ بیابن ویردانی میرٹھی

## جاڑا[1]

دھوم مچاتی سردی آئی    دانت بجاتی سردی آئی
دُھنیوں کے بھاگوں جاڑا آیا    تانت بجی اور راگ بھی پایا
ڈھک گیا مُنہ اور چھپ گئے ہاتھ    جاء البرد مع الجُبّات
دانت کی ڈونڈی گھر کا اکھاڑا    روئی کے پیچ نے سب کو پچھاڑا
کھیت کپاس کے پڑ گئے لالے    پالے کے سب پڑ گئے پالے
گھر گھر بانٹی دولت اس نے    سب کو دیا ہے خلعت اس نے
کسی کا شالی مول میں بھاری    کسی کی کملی تول میں بھاری
جیت گیا گر پالا پاسے    کھیت رہے تمباکو والے
غل بل کرتے پھرتے ہیں گُل    کابلیوں کا ٹوٹا ہے پُل
میوہ تولنے والے آئے    پشتو بولنے والے آئے
نکلے چیتے جھاڑی سے    اُترے ریچھ پہاڑی سے
جوؤں میں کپڑے تو بھرے ہیں    روڑ میں کیا انگور بھرے ہیں
شکل سے بیٹھی ہے اک جولا    کابل جائیگی جوؤں کی ٹولا
بہیسہ و انیک میوہ باد شکم    کابلیم انگور تمر و شکم
ہو گیا سب کا کلیجہ ٹھنڈا    کھوپڑی ٹھنڈی کلیجہ ٹھنڈا
دھنیوں کے بھی ہوش اُڑ گئے    دھنتے لگے سر روئی کے بادلے

[1] ادیب ۔ الہ آباد ۔ دسمبر ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۸۵

کان پہ دھرا ہاتھ اب بھی دُھن سے
کان کے بدلے ہاتھ ہیں سُن ہے

روئی کے بادل آ گئے سر پر
باندھ کے دل سب چھا گئے سر پر

رہ رہ کے بجے لڑکے کے دانت
دل یا دل میں کڑکے دانت

آگ سے سچ مچ لاگ ہے سب کو
آس اولاد کی آگ ہے سب کو

گود میں لی تپائی سے لگا لی
آجکل آگ ہے ننھی بالی

شب کو انگیٹھی سب کے قریں ہے
کوئلوں پر اب مہر نہیں ہے

اِک اِک عضو ہوا ہے ٹھنڈا
چار مہینے بند ہے وضو ندا

ٹھٹھرے ہوئے ہیں لوگ جہاں کے
گرم فقط مضموں ہیں بیاں کے

## اُمید

### غزل

کلیسا میں بُت کی ادا بن گئی تو
حرم میں پہنچ کر خدا بن گئی تو

یہ پردے کی ہے بات سُن لے نہ کوئی
کہ پردے میں کیا جانے کیا بن گئی تو

اکٹھا کیا تو نے بچھڑے ہوؤں کو
کہ جنگل میں بانگِ درا بن گئی تو

بجھانے ترے جھلسوں کی بے بس پیاسیں
بیاباں میں کالی گھٹا بن گئی تو

اڑے تیرے جھونکوں سے بیکس مسافر
کہ صحرا میں ٹھنڈی ہوا بن گئی تو

لگائی ہے لو تجھ سے اُجڑے ہوؤں نے
اندھیرے گھروں کا دیا بن گئی تو

تیری لاگ سے زور گھٹنوں میں آیا
کہ دکھیا تنوں کی عصا بن گئی تو

سکت رہنے تاکا اندھیرے میں تجھ کو
سنبھالے سے آپ بقا بن گئی تو

گریباں میں چل کر جنوں ہو گئی تو
دوپٹے میں چھپ کر حیا بن گئی تو

ہراک راہ میں راہبر ہو گئی تو
ہراک ناؤ میں ناخدا بن گئی تو

ہراک رنج و غم کو کیا محو تو نے
ہراک درد دکھ میں دوا بن گئی تو

یہاں تو وہاں تو سفر تو جہاں تو
جزا بن گئی تو سزا بن گئی تو

دلوں میں اُتر کر تمنّا ہوئی تو
زبانوں پہ چڑھ کر دعا بن گئی تو

بیاباں کے سوا تو نے سب سے نباہی
یہیں آن کر بے وفا بن گئی تو

# مہاراج بہادر برق دہلوی

## ششکتی بان

تو شکتی بان کھا کے جو اے وِیر غش میں ہے
فرطِ الم سے جانِ حزیں کش مکش میں ہے

چھائی ہوئی جو رُخ پہ تیرے مردنی سی ہے
مُنہ دیکھ کر تیرا مجھے خود جاں کنی سی ہے

بے حس پڑا ہُوا ہے جو تو فرشِ خاک پر
گرتی ہیں بجلیاں دلِ اندوہناک پر

تو گود میں اجل کی جو سرگرمِ خواب ہے
اِک اِک نفس مجھے دمِ تیغِ پُر آب ہے

کیا حادثہ یہ گردشِ قسمت دکھا گئی
کیوں لکشمن مجھے تیری آئی نہ آ گئی

بے ہوش ہو کے رن میں جو تو خاک پر گرا
آکاش کیوں نہ سر پہ مرے ٹوٹ کر گرا

آنکھوں کے سامنے مری تو غرقِ خوں ہُوا
میرا نہ حال کیوں تیرے آگے زبوں ہُوا

کیوں اگنی بان سے ترا دل چاک ہو گیا
میں کیوں نہ جا کے تیری جگہ خاک ہو گیا

دشمن کا تیر تجھ کو پیامِ فنا ہُوا
تیرے ہی بجائے کیوں نہ مرا دم فنا ہُوا

سالہ مطلعِ انوار - پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۰۳ تا ۱۰۶

اے لکشمن ابھی تیرے مرنیکے دن نہ تھے
مجھ جاں بلب سے پہلے گذرنیکے دن نہ تھے

تو میرے دل کا چین تھا آنکھوں کا نور تھا
تیرے ہی دم سے مجھکو میسر سرور تھا

سب بھائیوں میں جان سے پیارا تھا ایک تو
لے دیکے اس بپت میں سہارا تھا ایک تو

میرا شریکِ درد رضا جو تھا تو مرا
سچ تو یہ ہے کہ قوتِ بازو تھا تو مرا

تجھ سے ہی دل قوی تھا مرا رزمگاہ میں
راون کو تیرے بل پہ سمجھتا تھا کاہ میں

بے دست و پا ہے رام جو لچھمن جتی نہیں
بے سر ہے فوج تجھ سا جو سیناپتی نہیں

آنکھیں تو کھول لب تو ہلا کیوں خموش ہے
ہے میرا دم لبوں پہ کچھ اسکا بھی ہوش ہے

زانو پہ کس کے سر ہے ذرا دیکھ تو ادھر
یہ کون نوحہ گر ہے ذرا دیکھ تو ادھر

مُنہ تک رہا ہوں مُنہ سے ذرا بول تو سہی
او محو خواب آنکھ ذرا کھول تو سہی

مجھ غمزدہ کا آخری ارماں نکال دے
بھیّا مرے گلے میں تو باہیں تو ڈال دے

آیا تھا میرے ساتھ اُجدھیا سے بن میں تو
تنہا غضب ہے چھوڑ چلا آج رن میں تو

بچپن سے ایک جان دو قالب رہا ہے تو
مطلوب میں ترا مرا طالب رہا ہے تو

اپنی نظر سے دور نہ اک پل کیا کبھی
مجھ کو نہ تو نے آنکھ سے اوجھل کیا کبھی

سایہ کی طرح میرے رہا ساتھ ہر گھڑی
تو دستِ راست تھا جو مصیبت کوئی پڑی

بن باس میں بھی ساتھ دیا راج چھوڑ کر
خاکِ قدم کو سر پہ رکھا تاج چھوڑ کر

مانا کہ اور لاکھ ہیں آرام جاں حبیب
اب تجھ سا جاں نثار برادر کہاں نصیب

کس مُنہ سے میں دھرونگا اُجدھیا میں پاؤں اب
پاؤنگا لکشمن میں کہاں تیری چھاؤں اب

تجھ کو میں اپنے ساتھ جو لے کر نہ جاؤں گا | ماتا سومترا کو میں کیا مُنہ دکھاؤں گا
پوچھیں گے جب بھرت تو میں دونگا جواب کیا | مجھ میں رہیگی آنکھ ملانے کی تاب کیا
تیرے بغیر قالبِ بے جاں ہے تن مرا | اے کاش پیرہن ہی مرا ہو کفن مرا

بے کل ہے دم نکلنے کو تن سے ہوگ میں
سیتا کا دکھ بھی بھول گیا تیرے سوگ میں

تھا اس طرف تو رام تھے فریاد و آہ میں | ناگاہ شور مچ گیا ساری سپاہ میں
پربت سے بوٹی لیکے ہنومان آگئے | مُردہ دلوں کے کھوئے ہوئے پران آگئے
سنجیونی نے معجزہ اپنا دکھا دیا | فی الفور محوِ خوابِ عدم کو جگا دیا
اُٹھتے ہی لکشمن نے لئے رام کے قدم | دونوں بڑھا کے ہاتھ گلے سے ملے بہم

ہر سو صدا بلند ہوئی خاص و عام کی
جے لکشمن کی جے ہو مہاراج رام کی

## پھول[1]

پھول کیا ہیں؟ دلِ مایوس کی اُمیدیں ہیں | یہ وہ الفاظ ہیں بچے ہیں شناسا جن کے
سب سے پیاری ہے یہ مخلوق مگر ربِّ قدیر | پھونکتی بھول گیا رُوح بدن میں ان کے

ہم سے کرتے ہیں یہ پھول اشارے ہی فقط | آسماں اور خدا سے ہیں یہ محوِ تقریر
ہو کے آوارۂ دامانِ فضا نکہتِ گل | اپنی شیرینی کی کرتی ہے دو بالا تاثیر
مست و بیتاب رہا کرتی ہے یوں موجِ شمیم | جس طرح ساز کے نغموں کی صدائے دلگیر

چرخ پہ تاروں میں بالائے زمیں پھولوں میں | نام لکھتا ہے قلمکارِ حقیقی اپنا

[1] مطلعِ انوار - صفحہ ۱۹۱ - ۱۹۲

پھول ہیں مادرِ قدرت کی زبانیں گویا
جن سے کرتی ہے وہ اسرارِ محبّت افشا

---

پھول کیا ہیں؟ یہ ہیں دامانِ زمیں کے تارے
کیسے دلکش ہیں سنہری ہیں یہ پیارے پیارے

---

اس لئے کھلتے ہیں کچھ پھول کہ خنداں ہو کر
بوئے شیریں سے معطّر کریں بادِ صحرا
گل وہ خوشیاں ہیں جہاں کی وہ گہر ہائے اُمید
جو یہ کہتے ہیں ہمیں پھول نہ جانا اصلا

---

پھول دیتے ہیں ہمیں عیش و مسرّت کا پیام
جلوۂ حسن کا۔ موسیقی و نکہت کا پیام

# افتخار حسین جگر بسوانی

## کسان کی لڑکی[1]

خوب چھائی ہے آسماں پہ گھٹا
ہے مہینہ شروع ساون کا
آج برسا ہے رات بھر بادل
بھر دیئے آسمان نے جل تھل
دیکھنا بڑھ کے گاؤں کا منظر
گھر ہیں مٹی کے پھوس کے چھپر
چھوٹے چھوٹے مکان وضع عجیب
راستے کم وسیع بے ترتیب
گرد ہر گھر کے ہے رواں پانی
جس طرف جائیے وہاں پانی
گاؤں سے جب نکل کے جاتے ہیں
دھان کے کھیت لہلہاتے ہیں
سبز پوشو نسے ڈھنگ میں اچھے
ہیں زمرد سے رنگ میں اچھے

---

[1] خدنگِ نظر۔ لکھنؤ۔ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۹ تا ۲۰

سیر سے دل کا باغ ہو تازہ
دیکھنے سے دماغ ہو تازہ

دیکھو وہ کھیت دھان کا دیکھو
کس قدر ہے ہرا بھرا دیکھو

کھیت میں کر رہے ہیں کاہ کشی
اِک کسان اور کسان کی لڑکی

باپ کا سن پچاس سال کا ہے

گو جوانی نہیں رہی باقی

جھُرّیاں پڑ چکی ہیں چہرے پر
پر قوٰی ہیں صحیح و زور آور

شب کو پھیلا کے پاؤں سوتا ہے
دن کو مصروفِ کار ہوتا ہے

کام سے دم نہ اُلجھے بہلے جی
اس لئے ساتھ ساتھ ہے لڑکی

ایک جانب کدال کو رکھ کر
ہاتھ رکھتا ہے دوشِ دختر پر

خوش نصیبی سے خوش ہے وہ معصوم
باپ کے ہاتھ کو ہے لیتی چوم

دل کا سب بوجھ ٹال دیتی ہے
باہیں گردن میں ڈال دیتی ہے

بھولے انداز بچپنے کے دن
دس برس سے نہیں زیادہ سن

نیک سیرت قبول صورت بھی
باتوں میں کمسنی کی لکنت بھی

کالا کُرتہ گلے میں ساری لال
ننھّا سا قد سیاہ لمبے بال

میٹھی میٹھی زبان میں باتیں۔
ہیں گنواری زبان میں باتیں

کھیت کو جانتی ہے کاشانہ
باپ ہے شمع وہ ہے پروانہ

جستجو کپڑے کی نہ کھانے کی
نہ اُسے فکر کچھ زمانے کی

نہ غریبوں کے حال کی پروا
نہ امیروں کے مال کی پروا

واہ رے عمر واہ رے بچپن
نہ غمِ دوست نے غمِ دشمن

کثرتِ مال و زر ہے تو خوش ہے
گھر میں فاقہ اگر ہے تو خوش ہے

رنج و غم ہو کہ راحت و آرام
اُسکو ہنس ہنس کے کھیلنے سے کام

وہ ہر ہیں زندگی غنیمت ہے — کمسنی اور بھی غنیمت ہے
اس کا ہر رنگ و طور اچھا ہے — خورد سالی کا دور اچھا ہے
کچھ غم و انتشار اس میں نہیں — مے ہے لیکن خمار اس میں نہیں
اس کی کیفیتیں ہیں متوالی — خوب رہتی ہے فارغ البالی
خانہ داری کا غم نہ کام کی فکر — صبح کی کچھ خبر نہ شام کی فکر

دونوں یکساں ہیں اے جگر گیاہی
عہدِ طفلی زمانۂ شاہی

# شبیر حسین جوش ملیح آبادی

## نغمۂ سحری

چھاؤں میں تاروں کی ملتی ہیں مجھے گاتی ہوئی — راہیں کھیتوں کے کنارے پیچ و خم کھاتی ہوئی
ہو رہی ہے صبح یہ طالع کہ دوشیزہ کوئی — آ رہی ہے کھیلتی کنگن سے شرماتی ہوئی
چھو رہی ہے سوز میں ڈوبی ہوئی پہلی کرن — دل کے زخموں کو مژہ کی یاد دلواتی ہوئی
آ رہی ہے اوس میں ڈوبی ہوئی ٹھنڈی ہوا — کُنج میں چھپتی ہوئی کلیوں کو چٹکاتی ہوئی
کہہ رہی ہیں اہلِ باطن سے حدیثِ حسن و عشق — پتلی پتلی ٹہنیوں پر بلبلیں گاتی ہوئی

اُٹھ رہی ہیں عرش کی جانب سے بیدار جوش
ڈوبتے تاروں کی آنکھیں نور برساتی ہوئی

---

ل زمانہ۔ کانپور۔ مارچ ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۸۱

## ترانۂ بہار۱؎

پھر بہار آئی ہوا سے بوئے یار آنے لگی
پھر پپیہے کی صدا دیوانہ وار آنے لگی

پی کہاں کا شور اٹھا حق سرہ کا غلغلہ
کوئلیں کوکیں صدائے آبشار آنے لگی

کھبت جھومے بور آیا پھول جھکے دل کھلے
کونپلیں پھوٹیں ہوائے مشکبار آنے لگی

پھر درختوں نے زمیں سے رنگ چوسے نو بہ نو
پتیوں میں پھر نظر شکل بہار آنے لگی

پھر مری ہر سانس اک خوشبو کی دنیا ہو گئی
پھر ہوائے طرۂ گیسوئے یار آنے لگی

پھر کھنے باغوں میں چھیڑا مست چرواہے نے راگ
پھر صدائے نغمہائے شاخسار آنے لگی

پھر ہوائے سرد کے جھونکوں میں میخانے کھلے
پھر لب جاں بخش سے بوئے خمار آنے لگی

کھینچتی پتوں پہ خط رنگ بسنتیاں بھرتی ہوئی
پھر عدبا پہنے ہوئے پھولوں کے ہار آنے لگی

پھر سماعت سے ملائم ساز نے کی چھیڑ چھاڑ
پھر صدائے بربط و چنگ و ستار آنے لگی

پھر شگوفے مسکرائے پھر چلی ٹھنڈی ہوا
یاد اک عالم کی پھر بے اختیار آنے لگی

جوشؔ پھر رسنے لگے ٹوٹے ہوئے وعدوں کے زخم
پھر میرے سینے سے بوئے انتظار آنے لگی

---

# برج نراین چکبست لکھنوی

## قوم کے سورماؤں کو الوداع۲؎

ساحل ہند سے جرار وطن جاتے ہیں
کچھ نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں

رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں
تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں

---

۱؎ زمانہ۔ کانپور۔ اپریل ۱۹۲۲ء۔ صفحہ ۲۲۹ ۲؎ صبح وطن۔ بار اول۔ الہ آباد۔ صفحہ ۸-۱۰

سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

اِن کی رگ رگ میں ہیں پیوست شجاعت کے چلن    رن کا میدان ہے انکے لئے ماں کا دامن
عرصۂ جنگ کی موت انکو ہے اِک شب کی دلہن    مرکے تلوار سے حاصل ہو تو خلعت ہے کفن

جوش انہیں جو ہے اُس جوش کا اب دَور نہیں
ساٹھ پشتوں کے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا    طنطنۂ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا    ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کیلئے
ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کیلئے

جس گھڑی معرکۂ جنگ میں ہو تیغ علم    سورما لڑتے ہیں اس طرح پکارے عالم
دل ہو ارجن کا جگر بھیم کا انگد کا قدم    موت کے وقت نظر میں ہو شبیہ بھیشم

جس کا قابو نہ چلا موت کی تدبیروں پر
سایۂ تیغ میں آرام کیا تیروں پر

ہو وہ یورش کہ ہو شیرازۂ اعدا برہم    اِک اُمنڈتے ہوئے دریا کا ہو پیدا عالم
جو کسی سے نہ جھکا وہ سر مغرور ہو خم    پہلے برلن میں جو پہونچے وہ تمہارا ہو قدم

"وہ گرو" کہہ کے بڑھو خون کے مخصر کھلجائیں
پھر ہری سنگھ کی تلوار کے جوہر کھل جائیں

تم کو اعزاز ملا ہے یہ وطن کا اعزاز    دیکھنا اب ہے شجاعت کا تمہاری انداز
خاکِ یورپ پہ دلیری سے ہو اپنی ممتاز    تیغِ ہندی کی اصالت پہ زمانہ کو ہو ناز

قوم کا اوج بڑھے نام وطن زندہ ہو

روح پرتاپ کی جنت میں نہ شرمندہ ہو

یا ظفریاب تمہیں دیکھ کے دل ہو بشاش | آئے یا سوئے وطن خون میں ڈوبی ہوئی لاش
سر جدا تن سے ہو یا ہو تنِ بسمل صد پاش | گوشۂ امن و امان کی نہ ہو آنکھوں کو تلاش

موت معراج ہے اس دشت کے راہی کیلئے
آنچ تلوار کی جنت ہے سپاہی کیلئے

گو کہ دنیا سے مٹے شوکتِ قیصر کا سراغ | شعلۂ تیغ سے مرجھائے نہ تہذیب کا باغ
گل نہ ہو دل کے شوالے میں حمیت کا چراغ | بیگناہوں کے لہو کا نہ ہو تلوار پہ داغ

راستہ ہے یہی قوموں کی تباہی کے لئے
خون معصوم کا دوزخ ہے سپاہی کے لئے

مادرِ قوم کا ہے اپنے سپوتوں سے پیام | خطۂ ہند کا اس جنگ میں روشن رہے نام
تیغِ خونریز نے جس شان سے چھوڑا ہے نیام | اپنے مسکن میں اسی شان سے پائے آرام

شاعرِ گوشہ نشیں شکرِ خدا کرتا ہے
جنگ ہو تم کو مبارک یہ دعا کرتا ہے

---

## سبز ڈیرہ دون [۱]

لباس پہنے ہیں کل خشت و سنگ سبزہ کا | بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزہ کا
کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں | ٹھہر گئی ہے بہار آ کے اس گلستاں میں
نگہ کو دور سے پانی ہے جو نظر آتا | سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا
فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے | بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے

---

[۱] صبحِ وطن - الہ آباد صفحہ ۶۵ سے ۶۷

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دل گیر | شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر
یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں | یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں
وہی سُنے گا اِسے دل گداز ہے جس کا | ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اِسکا
یہ راگ مجھ میں سمایا سرور مے ہوکر | ہوس تھی روح کو مل جائے اِہیں طے ہوکر
شراب اُنس حقیقی سے تھا ہر اِک سرشار | شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ مُشتِ غبار
درخت و کوہ ہیں کیا ذاتِ پاک اِنساں کیا | طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابر و باراں کیا
یہ موجِ ہستی بیدار کے عناصر ہیں | سب ایک قافلۂ شوق کے مسافر ہیں
یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے اِنہیں بیر نہیں | سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں
انہیں سے نغمۂ قدرت ہے اوج و پستی میں | سب ایک ساز کے پردے ہیں بزمِ ہستی میں
جدا کسی سے بھی ہستی کا اپنی راز نہیں | کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں
ہے جسمِ خاک یہاں اُس کا جسم پانی ہے | جو روح ہم میں ہے اُسمیں وہی روانی ہے
اسی خیال میں طبع لطیف تھی سرشار | کچھ ایسی بے خبری تھی کہ ہوش اُسپہ نثار
دل اپنے رنگ میں بیتاب تھا اس ارماں سے | کہ اس فضا میں ہو آزاد روح زنداں سے

اجل جو آئے تو اس کوہسار کے نیچے
بنے مزار کسی آبشار کے نیچے

---

مٹا[ل] جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے | نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے | نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

---

ل دل۔ صفحہ ۱۸-

# الطاف حسین حالی پانی پتی

## شعر کی طرف خطاب[۱]

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو

حسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو
آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو

تو نے کیا ہے بحر حقیقت کو موج خیز
دھوکے کا غرق کر کے رہیگا جہاز تو

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری
قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو

اہل نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز
جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو

نک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ
معذور جان اُن کو جو ہے چارہ ساز تو

چپ چاپ اپنے سچ سے کئے جا دلوں میں گھر
اونچا ابھی نہ کر علمِ امتیاز تو

جو نابلد ہیں اُن کو بتا چور بن کے راہ
گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو

عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو

اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل
بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

ہوتی ہے سچ کی قدر یہ بیقدریوں کے بعد
اِسکے خلاف ہو تو سمجھ اسکو شاذ تو

جو قدرداں ہوا پتا اُسے مغتنم سمجھ
حالی کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تو

---

۱ مقدمہ مع دیوان حالی۔ ۱۸۹۳ء مطبع انصاری۔ دہلی صفحہ ۱۸-۱۹۔

# مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عُذر

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر۔ حیف / طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں / جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب۔ کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ / سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہی خالی
گر غزل لکھیئے تو کیا لکھیئے غزل میں آخر / نہ رہی چیز وہ مضمون سوجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف / گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجئے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں / لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچئے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر / کیجیئے درد جدائی کی کبھی نقّالی
تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح / وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہُوا ہے خالی

پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلاّلی

# فضل الحسن حسرت موہانی

## غزل [1]

منزلِ وصلِ یار ہے پیدا / درمیانِ حدودِ بیم ورجا
دلِ انساں میں تابِ شعلۂ عشق / حُسنِ مطلق کی رو سے حق میں ضیا
پردہ حُسن و عشق میں ہے وہی (ق) الغرض نور ارض نورِ سما
پھر نہ کیوں وصلِ حُسن و عشق سے ہو / نُور بالائے نور جلوہ نما

[1] انتخاب دیوان حسرت موہانی۔ جلد دوم طبع اول صـ۲

جان دیدی پہونچکے اُنکے حضور / ہم نے اور اُن سے کچھ کہا نہ سُنا

اے تری یادِ ستمِ جان کا علاج / اے ترا ذکر دردِ دل کی دوا

کچھ بھی شہر وصال دور نہیں / جذبۂ شوق ہو جو راہ نما

ہم رضا کار ہیں خدا کی قسم / ہم نہ ہونگے مگر شہیدِ دغا

ہو گئے محو عشق سب حسرتؔ

اب غمِ ہجر ہے نہ شوق لقا

## غزل لہ

شوقِ وصالِ یار کے قابل بنا دیا / دل کیا تھی عاشقی نے اُسے دل بنا دیا

دیدے کے مفت جان شہیدانِ عشق نے / اس نازنین کو شاہدِ قاتل بنا دیا

شوقِ لقائے یار نے راہِ مُراد میں / سختی کو رشکِ نرمیِ منزل بنا دیا

آخر فراغتِ غمِ دل نے ہوس کو بھی / کونین کے خیال سے غافل بنا دیا

کیا چیز تھی وہ مرشد وہّاب کی نگاہ

حسرتؔ کو جس نے عارفِ کامل بنا دیا

## غزل ۵۲

حاصل جو ہوئے دردِ محبت کے لذائذ / میں بھول گیا عیش و فراغت کے لذائذ

جب تک نہ کھلے یہ کہ محبت ہے عبادت / محسوس ہی کیا ہونگے اطاعت کے لذائذ

ارواح پہ اعمال کے آثار ہیں طاری / دوزخ کے شرارے ہیں تو جنت کے لذائذ

پوچھے کوئی اربابِ تمنا کے دلوں سے / حسنِ رخِ جاناں کی حکایت کے لذائذ

لہ۔ ولہ تشنہ سم صفحہ سلہ ولمہ سشا

ڈرتے ہیں جو میدانِ وغا سے اُنہیں حسرتؔ
معلوم نہیں شوقِ شہادت کے لذائذ

## غزل ۱

پڑھیئے اس کے سوا نہ کوئی سبق | خدمتِ خلق و عشقِ حضرتِ حق
ترکِ غم پر بھی دردِ دل کا رہا | سالہا سال آرزو کو قلق
وصل میں بھی غذائے روح رہا | دردِ فرقت بقدرِ سدِّ رمق
مٹ گئے دل سے عاشقی کے نقوش | رہ گیا سادہ زندگی کا ورق

شعرِ حسرتؔ نے سارے کھول دیئے
عشقبازی کے عقدہائے ادق

## غزل ۲

روح کو محوِ جمالِ رخِ جاناں کر لیں | ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کر لیں
ان کو تکلیف جو خطِ شوق تو اربابِ صفا | نقشِ اخلاص کو زیبائشِ عنواں کر لیں
رنج راحت ہے اگر حسبِ تقاضائے مراد | اہلِ تسلیم ترے درد کو درماں کر لیں
اہلِ ظاہر سے چھپانا ہو تو لازم ہے کہ ہم | پردۂ جاں میں ترے درد کو پنہاں کر لیں
کیا کریں اسکے سوا تیرے تغافل کا علاج | کہ دلِ زار کو گرویدۂ حرماں کر لیں
جان دینا ہے تو کر دیں ترے قدموں پہ نثار | کام مشکل ہے تو مشکل کو ہم آساں کر لیں
طالبانِ کرمِ یار بہ رنگینیٔ عشق | دامنِ زہد پہ گلکاریٔ عصیاں کر لیں
دل میں جا دینے کے ترے درد کو اربابِ جنوں | اب بھی گر چاہیں تو گنجائشِ ایماں کر لیں

[illegible] ۲۵   [illegible] ۴۹

آپ اُسے شوق سے مہمان بلائیں حسرت
کچھ مگر نذرِ دل و جاں کا تو ساماں کرلیں

# حفیظ الکریم حفیظ

## بسنت رُت[1]

بسنت آگیا باغوں میں کوک اُٹھی کوئل — اُمنگ پہ ہیں شجر پھوٹنے لگی کونپل
یہ سبز سبز درختوں میں برگِ سبز نہیں — لٹک رہا ہے کسی سبزہ رنگ کا آنچل
نکالا عارضِ گُل نے وہ آج رنگ روش — کہ جس پہ جاتے ہی پائے نگاہ جائے پھسل
وہ جوشِ گُل ہے کہ باغوں میں اُڑ چلی بُلبل — بہار دیکھ کے چلتے ہیں مور پنجوں کے بل
تمام باغ میں چھایا ہوا ہے رنگِ عیش — بنا ہے آشیانِ بُلبل کا آج رنگ محل
وہ ساز و برگِ طرب ہے کہ ناچتے ہیں مور — بہار آتے ہی جنگل میں ہو گیا منگل
نکل رہے ہیں نئے سر سے پھر نئے پتّے — نکھار پر ہیں شجر اس طرح کہ صل و جل
وہ جوشِ گُل ہے کہ پھولی بہار آنکھوں میں — اٹھایا سبزہ کو دل اس طرح اُٹھی کوپل
ہر اک نہال کو بخشا ہے آ کے حُلّہ سبز — جہاں میں شاہِ بہاری کا چار سو ہے عمل
نظر فریب ہے کھیتوں میں پیا زرتی کا کھیت — رواں ہے نہروں میں پانی بھی صاف اور نرمل
غبار دل کا اُڑا لے گئی نسیمِ بہار — ہوا ہے موسمِ گُل سے کھلا ہے دل کا کنول
چمن میں پھولوں کی خوشبو سے سرگراں ہو کر — لگایا سر میں عروسِ بہار نے صندل
ہوا کے زور سے ہلتے نہیں ہیں آم کے مور — یہ سر پہ شاہِ بہاری کے چلتے ہیں مورچھل
بہار آئی چلا میکشوں میں جھول کا دور — چمن میں بیٹھے ہیں لے کر گلاس اور بوتل

[1] ادیب - الہ آباد - مارچ [illegible] صفحہ ۱۵۶ و ۱۵۷

نکل کے شیشے سے یہ منہ لگی رنگیلوں کے  بسنت رُت میں چھپنا دُختِ رز کا شیش محل
دیا ہے بھر کے وہ ساقی نے آج رطلِ گراں  کہ ایک جام میں میخوار ہو گئے ہیں اٹل
نشے میں گرتا ہے جب لڑکھڑا کے کوئی مست  تو ہاتھ دے کے سبو کہتا ہے اُسے "نہ سنبھل"
بہار دیکھ کے سب کر رہے ہیں رنگ رلیاں  شراب خور جیسے بھٹیوں پہ ہو کے اٹل
چمن میں آج ہے جی بھر کے ساقیا رنگ رس  کہ چار دن میں خزاں آ کے رنگ دیگی بدل
ہنڈول رنگ کے گلے کی ملپت بھیرت دکھلا  ستار چھیڑ وہ مطرب ہو جسکا ٹھاٹ اچل
بہار آئی ہے مطرب بہار کی ہے بہار  سُنائے ہم کو اسی دُھن میں اک رنگیلی غزل
بتا ہیں ساقی و مطرب یا وہ رنگ چنگ کا رنگ  کہ رنگ ہے یہ زبان سے ہماری جائے نکل

---

بسنت آتی ہے جا بجا کا رنگ گلابی ہے  کبھی ترشح ہے کم کم کبھی فقط بادل
کبھی جہاں میں گہر بار ابرِ نیساں ہے  بنا یہ اٹیا محل جسکے دم سے موتی محل
چمک دمک ہیں کبھی اسطرح ہے بجلی بسنت  کہ جیسے ہو کوئی معشوق شوخ اور چنچل

کبھی فلک پہ گھٹائیں ہیں ابرِ بہمن کی
کبھی شعاعیں نظر آئیں مہرِ روشن کی

---

اُبھارتا ہے دلوں کا ہرا بھرا جنگل  چرند کرتے ہیں صحرا میں خوب کود اُچھل
پرند شاخوں پہ ہیں محوِ زمزمہ خوانی  نوائے خوش سے ہر اک سمت گونج اٹھا جنگل
یہ صحنِ باغ میں کیسا چہچہاتی ہیں چڑیاں  بہار دیکھ کے آپس میں کر رہی ہیں چہل
بسنتیوں میں کوئی سبزہ رنگ بیٹھا ہے  یہ زرد پھولوں میں کب ہیں ٹہرے ٹہر چل

---

بسنت پنچمی کی رنگ بھری ہے تیاری  بڑے جلوس سے نکلے تمام اہلِ دول

ہر ایک شہر میں ہیں راگ رنگ کے جلسے
بنا بسنت سے ہندوستان رنگ محل
ہر ایک سمت ابیر اور گلال کا ہے رنگ
اور آج کھیلتا ہے رنگ برج کا منڈل
سلام کرنے کو سب منگلا مکھی آئے
بہار آتے ہی بھارت میں ہو گیا منگل
ادا فروش ہیں سب گلرخانِ رنگیں مزاج
لئے ہیں نذر کو کچھ پھول اور نئی کوپل
اڑائے لیتا ہے دل ہر حسین بسنتی پوش
کہ رنگ دکھاتی ہے رنگیں ادا اونکی چھل بل
گھروں گھروں میں ہوئی دیوتاؤں کی پوجا
چڑھائے ہندوؤں نے پشپ اور گنگا جل
چڑھائے جاتے ہیں سرسوں کے پھول تھڑوں پر
بہار آئی ہوئے پھر بسنت کے دنگل
بسنتیوں سے بھرے ہیں بسنت کے میلے
کوئی تو آیا سواری میں اور کوئی پیدل
سب اپنی دھن میں بسنتی بسنت گاتے ہیں
خبر کسے ہے کہ ٹیڑھی ہے سُر کہ ہے کومل
یہ زرد پھولوں سے کب ہیں شجر بسنتی پوش
بسنتیوں کا مگر ہے ہجوم یا دنگل

---

مدن کے زور سے الست ہو گئے ذی روح
ہر ایک جسم میں ہے کام دیوتا کا عمل
بہار آئی زمانہ وصال کا آیا ہے
بہت دنوں سے تھا بھونرا فراق میں بیکل
نہیں ہے آپ میں پھولن کے کنج میں آکر
خمارِ عشق سے مدہوش ہے یہ مستِ ازل
لپٹ لپٹ کے لیا ہے کلی کلی کا رس
اور آج بلبل و گل ہو رہے ہیں دست و بغل

---

بسنت آئی تو آنکھوں میں کھل گئی سرسوں
ہے زرد زرد فرح بخش آج کل جنگل
بہار آتے ہی آئی بہار آموں کی
ہے کل کی بات کہ گوار کا پھول تھا یہ پھل
خبر بسنت کی کس کو تھی اسکی رُت کے قبل
ہے بور آم کا گویا بہار کا سگنل
بہار دیتے ہیں سرسوں کے پھول کھیتوں میں
ہوا ہے فرشِ زمیں زرد رنگ کا مخمل
تمام دشت میں پھولا ہے لالہ خود رنگ
کسم کے پیڑوں میں بھی سرخ پھول آئے نکل

ربیع نے ہم کو دکھائے ہیں رنگارنگ کے پھول
وہاں جو ڈھاک تو اس میں بسنت پھولی ہے

سرور دل میں ہوا رنگ دیکھ کر نیچرل
تمام رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں دشت و جبل

ہر اک درخت کے دامن سے چو رہا ہے رنگ
کہ سرخ ٹیسو کے پھولوں کا چھُپا ہے رنگ

# عبد الخالق خلیق دہلوی

## ہولی[1]

ہُوا ہے مست ہولی سے زمانہ
رنگیلوں کا رنگیلا ہے ترانہ

عجب مستوں کے گانے میں مزا ہے
انہیں پینے پلانے میں مزا ہے

مئے گلگوں جہاں تھوڑی سی پی لی
عجب تانیں اڑاتے ہیں سُریلی

نہ مدہم کی نہ پنچم کی خبر ہے
وہی سُر ہے گلا پھرتا جدھر ہے

کسی نے ہے گلے میں ڈھول ڈالا
ابھی باندھا ابھی پھر کھول ڈالا

کوئی طبلہ کوئی مردنگ لایا
کوئی ہاتھوں میں اپنے چنگ لایا

کوئی باندھے ہے سارنگی کمر سے
کوئی ڈفلی لئے نکلا ہے گھر سے

کوئی ایسا نرالا سانگ لایا
کہ کپڑے عورتوں کے مانگ لایا

سر بازار کوئی ناچتا ہے
پئے دیدار کوئی ناچتا ہے

کوئی گورا فرنگی بن کے آیا
سپہ سالار جنگی بن کے آیا

کسی نے بھیس جوگی کا بھرا ہے
کسی نے رُوپ روگی کا دھرا ہے

کوئی مجنوں کوئی لیلیٰ بنا ہے
کوئی کامن کوئی چھیلا بنا ہے

---

[1] ترجمان - لاہور - مارچ ۱۹۱۷ء - صفحہ ۱۴۴

مئے گلرنگ سے سرشار ہیں سب — خلیق شادماں کے یار ہیں سب
سمائی ہے یہی رندوں کے من میں — کسی صورت سے جائیں برج بن میں

رنگیلے شام سے کھیلیں گے ہولی
اسی گلفام سے کھیلیں گے ہولی

بھری پھولوں کی گیندوں سے ہے جھولی — مچا رکھی ہے سب سکھیوں نے ہولی
مئے عشرت کا پی کر جام دونوں — کھڑے ہیں آپ رادھے شام دونوں
پرستار رنگ ہے پچکاریوں سے — زمانہ تنگ ہے پچکاریوں سے
کسی کے تھال ہاتھوں میں دھرے ہیں — گلابوں اور عبیروں سے بھرے ہیں
جا بجا کچھ رنگ ہے ایسا جہاں میں — شفق چھائی ہوئی ہو آسماں میں
رنگیلی کھیلتی ہے کوئی ہولی — کسی نے ہاتھ میں کیچڑ ہے گھولی
کوئی گلباز ٹیسو مارتی ہے — نظر کے ساتھ گیسو مارتی ہے
کسی کی رنگ چُندری پر گلابی — کسی کی آئی رستہ میں خرابی
کوئی مٹکا اُٹھاتی رہ گئی ہے — کوئی دامن بچاتی رہ گئی ہے
کسی کے سر سے گھونگٹ ہٹ گیا ہے — دوپٹہ ہی کسی کا پھٹ گیا ہے
کسی کا ہار ٹوٹا موتیوں کا — یہ نقشہ برج میں ہے گوپیوں کا
فدا ہیں سانورے کی چھب کے اوپر — ادا و ناز و چشم و لب کے اوپر
خلیقِ شادماں میرے بسے من میں — کسی صورت سے جاؤں برج بن میں
کوئی جوبن میں مدہوماتی گجریا — بتادے نندگاؤں کی ڈگریا

مری چُندری سرک جائے کہ چولی
رنگیلے شام سے کھیلوں گی ہولی

# خواجہ دلِ محمد۔ دل

## یادِ آزاد[1]

اے موت تیرا حکم زمانے میں عام ہے
سکہ رواں جہاں میں ترا صبح و شام ہے
نسیاں کا دودھ پیتی رہی تب پلی ہے تو
ہاں بے حسی کے گلشنِ دل کی کلی ہے تو
اِک دم جو دیکھ پائے تری سرد مہریاں
دنیا کا غم بھی ہو تو ٹھہر جائے بے گماں
دیکھے تجھے تو جان کلیجے کو تھام لے
خونِ حیات سرد ہو گر تیرا نام لے
پت جھڑ ہے تیرے باغِ جہاں میں لگی ہوئی
تیری کمند گردنِ جاں میں لگی ہوئی
تاروں کے جلسے اُٹھتے ہیں ہر روز وقتِ صبح
شبنم کے موتی لٹتے ہیں ہر روز وقتِ صبح
جسموں سے روحیں اُڑتی ہیں پھولوں سے رنگ و بو
نقشہ ہے انقلاب کا یہ دہر چار سو

ہر روز ڈوبتے ہیں جو تارے نکلتے ہیں
گویا فنا کی راہ پہ ہر وقت چلتے ہیں

یہ زندگی کہ رونقِ دنیا ہے جس کیساتھ
میں دیکھتا ہوں اسکی بھی کنجی ہے تیرے ہاتھ
تانتا لگا ہُوا ہے کہ آیا چلا گیا
دو دن جمال اپنا دکھایا چلا گیا
فرصت حیات کی کوئی دم کا شمار ہے
سب اُس کے کاروبار کا تجھ پر مدار ہے
ظاہر میں گو کہ چاند بحسن و جمال ہے
خوفِ غروب دیکھیے صورت ہلال ہے
بجلی کی ہے چمک کہ ابھی ہے ابھی نہیں
بالو کی ہے جھلک کہ ابھی ہے ابھی نہیں

کِھلتے ہیں دِن کو پھول تو گرتے ہیں شام کو
باقی ہے گر بقا تو فقط اس کے نام کو

---

[1] زمانہ۔ کانپور۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۴۹ و ۲۵۰۔

ہاں اے نشاد رست ترا حکم عام ہے
شکی ہوں میں کہ اس میں بھی مجھ کو کلام ہے

ہاں اختیار سب مجھے معلوم ہیں تیرے
سب ذرّے میرے جسم کے محکوم ہیں تیرے

کہتے ہیں جس کو روح کچھ اسکی خبر بھی ہے
اے تیغ ترا نور پہ ہوتا اثر بھی ہے

تو خانۂ جسد کو گرا دے زمین پر
ہوتا نہیں اثر تیرا لیکن مکین پر

یعنی وہ اور شئے ہے جو اصلِ حیات ہے
مظہر یہ جس کے نور کی کل کائنات ہے

وہ نور آفتاب میں ہے لو گلاب میں
چشمک اسی کی پاتے ہیں برقِ سحاب میں

شہروں میں آدمی ہے چمن میں چنبیلی ہے
بوجھو جو بوجھتے ہو عجائب پہیلی ہے

انساں میں آکے مبدا فیضان ہوتی ہے
جو اہل دل ہیں اُنکے لئے جان ہوتی ہے

رہتی ہے گلستانِ تخیل میں جوں بہار
اور دیتی ہے بہار کو اک نور سے اُبھار

گلکاریاں دکھاتی ہے نظمیں بناتی ہے
ہوش و حواس کے لئے گلشن سجاتی ہے

سب اسکے زرخرید ہیں شاعر جو ہوتے ہیں
دانے گلِ اُمید کے سینوں میں بوتے ہیں

لوگوں کی گو نگاہ میں دیوانے ہوتے ہیں
شمع ازل کے نور کے پروانے ہوتے ہیں

کیا ہو گیا جو حضرتِ آزاد اب نہیں
جا سکتی اُن کی یاد بھلا دل سے ہے کہیں

یاد اُن کی دل کے واسطے آبِ حیات ہے
انکی نہیں وفات یہ باسِ حیات ہے

آزاد آفریں تیرے لطفِ زبان کو
دی چاشنی بیان کی ہندوستان کو

گو جیتے جی ہی ہم سے ہوا تو حجاب میں
قبل از غروب چاند تھا تیرا سحاب میں

آخر کو چلتی پھرتی وہ تصویر چھپ گئی
اردو زبان کے چاند کی تنویر چھپ گئی

آرام کر کہ کرنا اب آرام باقی ہے
ہاں تجھ سے بہتر کافی ترا نام باقی ہے

یکتائے روزگار تھا دنیا میں فرد تھا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

# رام تیرتھ رام گوجرانوالوی

## ابرِ کوہسار میں گیانی کی حالت[1]

بن کے گیسوے رُخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں — شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں
سیر کرتا ہُوا جس دم لبِ جُو آتا ہوں — بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سرپہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے — غنچۂ گُل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے
ہے مجھے دامنِ کوہسار میں سننے کا مزہ — آبشاروں کے وہ خوش نغمہ ترانہ کی صدا
وہ سرِ کوہ سے تھم تھم کے اُترنا میرا — گاہ مشرق کبھی مغرب کو یہ پھرنا میرا
ہر گھڑی پل میں نیا روپ بدلنا میرا — جامۂ صورتِ نو پہن نکلنا میرا
ہاتھ پر دودھ کی ٹھلیا کو اٹھاتے آنا — گاہ ہنستے ہوئے گاہ آنکھیں دکھاتے آنا
دوڑتے دُور سے وہ اشک بہاتے آنا — اور وہ تھم تھم کے اُترتے ہوئے گاتے آنا
کون کہہ سکتا ہے کیا میرا نشاں میرا پتا — حشر ڈھاتی ہے یہ البیل خرامی کی ادا
مجھ سے چلنے میں نہ ہوگا کوئی غافل بڑھ کر — گر پڑے ہیں مرے دامن کی گرہ کھل کے گہر

## گیانی ہمالہ میں[2]

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت میرے سر — خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر
سلسلہ میرا ہے یا بحرِ بلندی موج زن — رقص کرتی ہے مزے سے جس پہ سورج کی کرن
چشمۂ دامن ہے یا آئینۂ سیال ہے — دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رومال ہے
نہر چلتی ہے سرودِ خامشی گاتی ہوئی — آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی

ملے رام برشا۔ حصہ اول۔ عباسی پریس دہلی۔۔ رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ لکھنو بار اول صفحہ ۱۰۱-۱۰۲ سلے ولہ ص ۱۰۲

کاہِنا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کوہسار پر — خوشنما لگتا ہے یہ غازہ میرے رخسار پر
وہ اچھالی پنجۂ قدرت نے گیند اک نور کی — جھانکتا ہے وہ درختوں کے پرے خورشید بھی

## چاند کی کرتوت[1]

عجب گھومتے گھومتے رام کو — مِلا ایک تالاب سر شام کو
جولاہے کی ننھی پاس اِک جھونپڑی — تھی لڑکی وہاں کھیلتی اِک پڑی
ہوا چپکے سے سر سرانے لگی — اُدھر چاندنی دم دمانے لگی
میں کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکی وہیں — ہے بُت بن رہی اور ہلتی نہیں
کھلا مُنہ ہے بھولے سے مُسکا رہی — ہے آنکھوں سے کیا چاند کو کھا رہی
اُتر آنکھ سے دل میں داخل ہُوا — دلِ صاف میں چاند سب گھل گیا
کہو تو ارے چاند کیا بات ہے — یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا گھات ہے
پڑا عکس ہے تیرا تالاب پر — یہ لڑکی کے دل میں کیا تو نے گھر
دیا عالموں کو نہ جس راز کو — دکھایا نہ جو دُور بیں باز کو
ریاضی کا ماہر نہ جو پا سکا — نہ ہیئت سے جو بھید کچھ آ سکا
جولاہے کے گھر میں دیا سب بتا — ارے چاند کیوں جی ہُوا تجھ کو کیا

وہ ننھے سے دل میں یہ آرام کیا
غریبوں کے گھر میں تیرا کام کیا

نوٹ: مارے خوشی کے قافیہ و ردیف و اوزان وغیرہ کو رندانہ آزاد و دلا پروا سے سابقہ پڑ جائے تو پابندیٔ قانون کہن اور قیود سخن کا نجات پانا (رکست ہونا) لازم آتا ہے نظم کی زمین پر گئیں سینے عمر بس گذر گئیں۔ نظم کے آسمان پر تو ظفر اٹھاؤ

[1] سلہ ولہ - ۱۰۳

# گیانی کی محفل[1]

سر پر آکاش کا منڈل ہے دھرتی پہ سہانی محفل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا

جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں گاتی ہے ملار ہوا بابا

یاں پنچھی مل کر گاتے ہیں پیتم کے سندیس سناتے ہیں
یاں روپ انوپ دکھاتے ہیں پھل پھول اور برگ گیا بابا

دھن دولت آنی جانی ہے یہ دنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالم فانی ہے باقی ہے ذاتِ خدا بابا

# دیدِ عارف[2]

جو خدا کو دیکھنا ہو میں تو دیکھتا ہوں تم کو
میں تو دیکھتا ہوں تم کو جو خدا کو دیکھنا ہو

یہ حجابِ ساز و ساماں
یہ نقابِ پاس و حرماں

یہ غلافِ ننگ و ناموس
وہ دماغ و دل کا فانوس

وہ من و شما کا پردہ
وہ لباسِ ہیئت کردہ

وہ حیا کی سبز کائی
وہ فنا سیاہ رضائی

یہ لفافہ جامہ بر تن یہ اتار سنز تم کو
جو برہنہ کر کے جھانکا تو تمہیں میں خدا ہو

اے نسیمِ شوق جا کے
وہ اڑا دے زلف رخ سے

اے صبائے علم جا کر
دے ہٹا وہ خواب چادر

ابر سے پائے تندِ مستی
دے مٹا وہ ابرِ ہستی

اے نظر کے گیان گولے
یہ فصیل جھٹ گرا دے

---

[1] دل صفحہ ۹۷-۹۸ — [2] دل صفحہ ۹۵ تا ۹۷

کہ ہو جہل بھسم اک دم جلے وہم ہو یہ عالم
جو ہو چارسو ترنم کہ ہیں ہم خدا۔ خدا ہم

نہ یہ تیغ میں ہے طاقت　　نہ یہ توپ میں لیاقت
نہ یہ برق میں ہے یارا　　نہ ہے زہر ہی کا چارہ
نہ یہ کارِ تند طوفاں　　نہ ہے زورِ شیرِ غرّاں
کوئی جذبہ ہے نہ شہوت　　کوئی طعنہ نے شرارت

جو تجھے ہلانے آئیں تو ہو راکھ بھسم ہو جائیں
وہ خدائی دیدے کھولو کہ ہوں دور سب بلائیں

وہ پہاڑی نالے چھم خم　　وہ بہاری ابر چھم چھم
وہ چمکتے چاند تارے　　ہیں ترے ہی روپ نیارے
دلِ عندلیب میں خوں　　رخِ گل کا رنگ گلگوں
وہ شفق کے سرخ عشوے　　ہیں ترے ہی لال میٹھے

ہے تمہارا وہ رام تو رام ذرا گھر کو منہ تو موڑ دو
کہ رحیم رام ہو تم تم ہی تو خود خدا ہو

## قلبی حالتِ عارف[1]

نسیم بہاری۔ چمن سب کھلا　　ابھی چھینٹے دیدے کے بادل چلا
گلو بوسہ لو چاندنی کا ملا　　جواں نازنین اک سراپا بلا
ہوئی خوش ملا غنچہ کیا بھلا　　قریب آئی گھوری ہنسی کھل کھلا
نہ جادو سے لیکن ذرا وہ ہلا　　نگہ سے دیا کام کو جھٹ جلا

[1] ولہ۔ صفحہ ۹۳ سے ۹۵۔

کہ سب حسن کی جان میں ہی تو ہوں
مہ و مہر کے پران میں ہی تو ہوں

ہزاروں جمع پوجا سیوا کو تھے — تھے راجے چنور مورچھل کر رہے
تھے دیوان دھوتے قدم شوق سے — تھے خدمت میں حاضر مدح خواں کھڑے
رشی تم ہوا ذنار سب سے بڑا ہے — یہ سب دیکھ بولا لگا قہقہے

بڑا ہی نہیں بلکہ چھوٹا بھی ہوں
نہ محدود کیجئے گا سب میں ہی ہوں

بڑے طور سے لوگ سب چھیڑتے — ٹھٹھولی سے تھے پھبتیاں کہہ رہے
تڑا تڑ تڑا تڑ وہ پتھر جڑے — لہو کے نشاں سر پہ رخ پہ پڑے
پیاپے تھے زخم اور صدمے کڑے — تھے دیدے عجب مسکراہٹ بھرے

کہ ہر کھیل کی جان میں ہی تو ہوں
یہ لیلا کے بھی پران میں ہی تو ہوں

# ریاض احمد ریاض خیرآبادی

## انتخاب غزلیات[1]

آئے میخانہ میں جب مسجد جامع سے ریاض — ساتھ ہی آپ کے قبلے سے گھٹا بھی آئی

---

کیا کام ریاض اس سے ہے سو بار بہار آئے — ہم کو یہ حسین پھول بھی چننے نہیں دیتے

---

توبہ شکن یہ کون ہوا خم سے ہمکنار — کیا کیا ملی ہے لوٹ کے توبہ گناہ سے

[1] ادیب۔ الہ آباد۔ نومبر سنہ ۱۹۱۰ء صفحہ ۲۲۸۔۲۳۱

| | |
|---|---|
| سیری ہوئی نہ لذتِ عصیاں سے عمر بھر | کیا کچھ کیا مگر نہ بھرا جی گناہ سے |

---

| | |
|---|---|
| بالوں میں اپنے بیٹھ کے موتی پروئیے | آنسو نہ پونچھیے کسی آشفتہ حال کے |
| اُٹھوا دو میز سے مے و ساغر ریاض جلد | آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے |

---

| | |
|---|---|
| تمنّا کو تم اپنے منع کر دو | ہماری جان کے پیچھے پڑی ہے |

---

| | |
|---|---|
| شبِ غم کی سحر نہیں ہوتی | ہو بھی تو میرے گھر نہیں ہوتی |
| دن چڑھے تک حسین سوتے ہیں | ان کے گھر بھی سحر نہیں ہوتی |

---

| | |
|---|---|
| ہے ریاض اِک جوانِ مست خرام | نہ پیے اور جھومتا جائے |

---

| | |
|---|---|
| چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی | تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی |

---

| | |
|---|---|
| جدھر ہم خشتِ خم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے | جدھر ساغر لنڈھا دیں چشمۂ حیواں نکلتا ہے |

---

| | |
|---|---|
| یہ اُلجھے ہیں زاہد سے کیا شیخ صاحب | بڑھاپے میں کیوں داڑھی رنگوا رہے ہیں |
| کہ مسجد ہی کرنے ذرا میکدے سے ہیں | عصا ٹیکتے کیا ریاض آ رہے ہیں |

---

| | |
|---|---|
| ڈھل چکی ہے اب جوانی جائیگی | پی شرابِ ارغوانی جائے گی |
| موت سے بدتر بڑھاپا آئے گا | جان سے اچھی جوانی جائے گی |

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی — مے کدے سے اب پرانی جائیگی
پینے آتے ہیں فرشتہ خو ریاضؔ — حُور کے دامن میں چھانی جائیگی

---

کوئی جلنے یہی ہیں ایک جلوہ دیکھنے والے — بڑے وہ آئے موسیٰ جا کے تنہا دیکھنے والے
حنائی ہاتھ کا صدقہ بجھا دے اب لگی دل کی — لگا کر آگ اس گھر میں تماشا دیکھنے والے
یہ جتنے پینے والے ہیں ریاضؔ ان سب کے مرشد ہیں — ہمیشہ جامِ مے میں نورِ حق کا دیکھنے والے

---

اِک زمانہ جسے کہتا تھا کہ کافر ہے ریاضؔ — وہی بدکیش بڑا مردِ مسلمان نکلا

---

جنابِ شیخ نے مے پی تو منہ بنا کے کہا — مزا بھی تلخ ہے کچھ بُو بھی خوشگوار نہیں
حنا لگا کے پہنچتے ہیں گُلرخوں میں ریاضؔ — کچھ ان کی ریشِ مبارک کا اعتبار نہیں

---

قسمت کے پیچ مٹ نہیں سکتے کسی طرح — یہ بل نکل کے آتے ہیں زلفِ سیاہ سے

---

جو کھِلا[1] پھُول بنا زخم مرے دل کا ریاضؔ — جو کلی رہ گئی کھِلنے سے بنی دل میرا

---

بیٹھ کر چوری سے پینا پس خم — راز ہے گوشۂ تنہائی کا

---

تا میکدہ ریاضؔ کا جانا محال تھا — کس طرح یہ بزرگ خمیدہ کمر گئے

---

[1] تذکرہ آب بقا۔ عشرت لکھنوی۔ نولکشور پریس لکھنؤ صفحہ ۴۷ تا ۷۰

مئے سُرخ ابرِ سیاہ سبزہ و کوہسار ریاضؔ
یہ کوئی چیز نہیں توبہ اگر ٹوٹ نہ جائے

---

آئی بوتل بھی میکدے سے ریاضؔ
جب گھٹا آسمان پر آئی تا

---

باد احباب کو آجاتے ہیں مرحوم ریاضؔ
میکدے سے جو کوئی مستِ شراب آتا ہے

---

کسی کی چینِ جبین پر مجھے ہنسی آئی
ذرا سی تیغ چلی میرے امتحاں کیلئے

---

تھوڑی سی پیتا ہوں بڑھاپے میں بھی
کہ سبب ہو یہ توانائی کا

---

ادب سے وعظ کی صحبت میں ہم وہ شئی نہیں پیتے
ہمارے جام میں افشردۂ انگور رہتا ہے
ترے صدقے ترے ہاتھوں سے آنی پی ہے اے ساقی
ذرا اب تو بے پئے منہ پر ہمارے نور رہتا ہے

# اقبال وریاسخ ہنگامی

## جوشِ حمیت

علاءالدین خلجی کا ہے ہنگامِ جہانبانی
غضب چتوڑ گڑھ پہ حلقہ زن ہے فوجِ سلطانی
نہیں ہیں طمعِ زر کچھ مال و زر کی خاطر شہ ہیں
مگر اک حسنِ شہرت یاب بھی ہے حرص کا بانی
وہ ایسا حسن جس کی شان میں ہے زینت افزائی
حسین وہ کون؟ رانا بھیم سی کی پدمنی رانی
ابھی چتوڑ کا رانا بھیم سی چونکہ ہے کمسن
تو ساری ملکیت پر بھیم سی کی ہے نگہبانی

بہادر راجپوت آمادہ گو لڑنے پہ ہیں یکسر
مگر کچھ روکتی ہے خیلِ دشمن کی فراوانی

---

اثر لایا یہ استقلال محصورین کا بارے
عدو کے جوش پر پڑنے لگی گردِ پشیمانی

تو پھر اس شرط پر ہٹنے کو خلجی ہو گیا راضی
کہ دیکھے محض آئینہ میں عکسِ حسنِ جانانی

گوارا تھی مگر یہ بات بھی کب راجپوتوں کو
کہ جنسِ آبرو کی بہرِ دشمن یوں ہو ارزانی

کیا منظور رانی نے مگر پیغامِ شاہی کو
کہ اس سے تو زیادہ تھی بہائے خونِ انسانی

گیا وہ بندۂ نفس آ دا سے کر چند ہمراہی
کہ تھا کب راجپوتی بات میں کچھ نقصِ ایمانی

مگر لی عشق نے تو حسن سے تعبیر ہمسازی
بڑھے کچھ اور بھی نظارہ سے جذباتِ شہوانی

گیا جب بھیجنے آخر اسے لشکر میں پہنچانے
بنایا خسروِ پیماں شکن نے اس کو زندانی

رہائی شاہ نے موقوف کی رانی کی آمد پر
نکالی نامرادی نے یہ تدبیرِ ہوسرانی

خبر اس واقعہ کی جلد ہی چتوڑ گڑھ پہنچی
ابل اٹھا جوانمردوں کا اک دم خونِ شریانی

مگر کچھ سوچ کر رانی نے روکا جوشِ بیجا کو
ہوئی جاتے کو خود تیار سوئے خصم ہیجانی

کہا جوشِ حمیت نے کہ ہے وجہِ اسیری تو
تجھی پر فرض ہے اب مخلصی کی سعیِ امکانی

منگائے سات سو ڈولے وہیں پر اس فدائی نے
چھپا ہر ایک میں اک اک مسلح مردِ میدانی

اٹھایا ان کو یکسر بھیس بدلے راجپوتوں نے
وہ ڈولی آ کے نکلی گڑھ سے یوں با عزمِ پنہانی

خبر یارے یہ جا پہنچی شہِ عاشق کے کانوں تک
کہ آتی ہے لئے سکھیوں کو خود معشوقۂ جانی

ہوا وہ سن کے محوِ انتظارِ شوقِ بے پایاں
یہ دل پر ہو گیا طاری فریبِ رنگِ ایقانی

پہونچکر پدمنی نے شاہ سے اسطرح کہلایا
کہ آخر بار شوہر سے ملے با پاک دامانی

جو تسخیرِ دلِ معشوقہ تھی لازم بہر صورت
اجازت مل گئی مشتاق کو پھر تو بآسانی

مگر کچھ حد نہ تھی خلجی کے حیرت اور غصہ کی
چلی گڑھ کی طرف جس وقت رانا کو لئے رانی

بڑھی پھر تعاقب جب سپاہِ تستنال آگیں  تو نکلا آہ ہرڈ وے سے اِک جانباز لاثانی
محل میں گرچہ پہونچے کھیمسی اور پدمنی دونو  مگر ہاں ہوگئی ہر ایک ہمراہی کی قربانی
گیا اس طرح دشمن لڑتے لڑتے قلعہ کے دزتک  ہُوا جنگ و جدل سے پھر ظہورِ فتنہ سامانی
مگر دکھلائی کچھ ایسی بسالت راجپوتوں نے  کہ آخر ہٹ گئی فوجِ عدو باصد پریشانی

پھرا اکبار شاہِ بوالہوس مایوس سا ہوکر  مگر کب ختم ہونے کو تھی امیدوں کی طولانی
گیا پھر ایک فوجِ تازہ لے کر چند سال نہیں  ہوئی چتوڑ گڑھ کی جن کے ہاتھوں خفر گردانی
یکایک ہر طرف پھیلا جو یہ حالِ جفاکاری  تو سارے گڑھ میں پیدا ہوگئی تشویش و حیرانی
نہ تھی اصلا وہاں اب تک سپاہِ جنگجو کافی  کہ ہو جس سے کچھ اُمیدِ شکستِ دشمنِ جانی
جو کچھ تحقیق تھی طرزِ عمل کی لابدی اُسدم  تو رانا نے کیا پھر منعقد دربار ارکانی
مگر ہر ایک نے اُس جا سکوتِ حسرت افزا میں  خموشیِ اجل کی نامبارک فال پہچانی
کہا تب اِک پسر سے پھر چلے جا نیکو رانا نے  نہ تار ہجائے دل میں احتمالِ خانہ ویرانی
مگر منظور تھی کس کو اہانت روحِ باقی کی  کسی کو بھی نہ تھی زنہار پروائے تنِ فانی
جو پھر اصرار تھا پیہم تو بارہ شاہزادوں میں  اجیسی نے بالآخر بات اپنے باپ کی مانی
سُنی جب یہ خبر کُل ساکنانِ قلعہ نے بارے  ہوئی تب منظہر حسکم قضا ایمائے روحانی
بڑھا اک جذبۂ ایثار اُسدم راجپوتوں میں  بنی کیا کیا شہادت خیز خونِ دل کی جولانی

الگ زیرِ زمیں اک خانۂ تاریک میں ہر سو  غضب کی شعلہ ہائے نار سے پیدا ہے تابانی
ہزاروں دیویاں اب جارہی ہیں آہ جلنے کو  رواں ہے سب کے پیچھے پدمنی باخندہ پیشانی
جنوں زا ہے جو نکہ حفظِ عصمت پاکباز وں میں  نہیں سودائیوں کو کچھ خیالِ دردِ جسمانی
فنا ہو جانے کیسر آپہا اپنی قدر وانی پر  یہی تھا آہ اُسدم مقتضائے ذاتِ انسانی

غرض جوشِ حمیت نے اثر اپنا یہ دکھلایا
بنا اُٹ خاکِ آتش میں مزارِ حسنِ نورانی

ہُوا یہ عبرت آگیں خاتمہ نازک مزاجوں کا
ہے کیسا انقلاب انگیز ظلمِ چرخِ دورانی

ہیں اب صرف ابخراتِ ارض بھر نیکے لئے آہیں
نہیں جز خطّۂ ظلم آج کوئی بہر گریانی

---

ہوا جب خاک میں پوشیدہ یوں نورِ حیات آرا
بنی پھر تیرہ بختی سے فضائے دہر ظلمانی

وہیں تب راجپوتوں نے بھی پہنے کیسری بانے
ہر اک نے آہ دل میں اُڑ کے مرجانیکی یوں ٹھانی

بجاہ جسم تو اب کچھ نہ تھی اُمیدِ آسائش
ہوئے تیار سب بہرِ حصولِ حظِّ روحانی

غرض نکلا گروہ سر فروشاں گڑھ کے پھاٹک سے
کہ جانبازی کے لے دشمن سے بھی بلج ثناخوانی

ہوئے مقتول اور مجروح گو چاروں طرف اعدا
دکھائی گرچہ تیغِ خوں فشاں نے اپنی برّانی

بنی گو ایک خطِّ سرخروئی وہ فضا ساری
زمیں کا رنگ گو تحریرِ خونیں سے ہوا قانی

مگر لڑتے ہی لڑتے کٹ مرا ہر راجپوت آخر
نہ افزونی کے آگے آہ کام آئی گرانجانی

غرض یوں جیت کر خلجی ہُوا پھر قلعہ میں داخل
کہ پوری وصل سے اب عشق کی ہو شرطِ جہانی

وہاں لیکن بچا رکھا تھا کیا شوقِ شہادت کا
نمایاں تھی تباہی ہر طرف بارنگِ عریانی

ہُوا برہم مزاجِ شاہ اُس دم نااُمیدی سے
نہ آیا ہائے دل میں ذرہ بھی افسوسِ نادانی

رہِ غارتگری سے پھر لیا مالِ غنیمت سب
ہوئی اس طرح کچھ آسودگیِ آزِ نفسانی

غرض شہ کی جفاکوشی پہ بھی جوشِ حمیّت نے
نہ ہرگز آبروئے خاص پر پھرنے دیا پانی

---

# درگا سہائے سرور جہان آبادی

## پریاگ کا سنگم[1]

جب صانعِ ازل نے صورت تری بنائی
ہونٹوں کو جاں دہی دی آنکھوں کو جاں فزائی

خاکہ بنا کے کھینچا یوں نقشِ ناز تیرا
بول اُٹھی تبسم لبوں کی دل نشاں دلربائی

بخشی تیری زباں کو لعلِ شکر فشاں کو
کچھ شہد کی حلاوت کچھ قند کی مٹھائی

نقشہ بنا کے تیرا صنّاعِ دو جہاں نے
تصویر تیری چومی اور آنکھوں سے لگائی

خلوت سے سج کے دُلہن نکلی حیا جو تیری
آبِ رواں کی چادر ہلکی سی اک اُڑھائی

جلوے نے تیرے مجھ کو بیخود کیا کچھ ایسا
حیرت تجھے دکھانے آئینہ لے کے آئی

حُسنِ ازل نے جس کو پایا نہ تیرے قابل
حصے میں مہر و شوق کے آئی وہ خود نمائی

گنگا بڑھی اُدھر سے جمنا بڑھی اِدھر سے
اجزائے حُسن نے یوں ترکیب مل کے پائی

وابستہ ہو گئے وہ دامانِ دلفریبی
دونی نہ آہ کیونکر ہو شانِ دلفریبی

دلکش عجیب سنگم ہے اتصال تیرا
سینے میں موجزن ہے شوقِ وصال تیرا

آنکھوں میں پھر رہی ہے تصویرِ حُسن تیری
بے چین کر رہا ہے دل کو خیال تیرا

صورت ہے آہ تیری تمثالِ دلفریبی
اور نقشِ دلنشیں ہے نقشِ جمال تیرا

تیری تجلیاں ہیں آئینہ دارِ تمکین
جلوہ فروشِ حیرت غنج و دلال تیرا

اِک اِک ادائے دلکش ہے بے عدیل تیری
ایک ایک ناز و لہجہ بے مثال تیرا

الفت تیری دلوں میں سودا ترا سروں میں
ہے آہ اک زمانہ شوریدہ حال تیرا

---

[1] ادیب الہ آباد۔ مارچ ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۴۴

موجوں میں آہ تیری ہے شانِ کجکلاہی — بل بے غرور تیرا اُف رے جلال تیرا
پانی میں آہ تیرے ہے زیست کی حلاوت — شیریں ہے انگبیں سے آبِ زلال تیرا

امرت برس رہا ہے یعنی تیری زباں سے
موتی ٹپک رہے ہیں لعلِ گہر فشاں سے

آنکھوں کو ہے یہ حسرت اُف رے تیری ادائیں — لوٹیں تیری بہاریں دیکھیں تیری فضائیں
ساحل پہ آہ تیرے ہیں محو بے خودی ہوں — اور لے رہی ہوں تیری موجیں میری بلائیں
گردوں پہ روشنی ہو تاروں کی ہلکی ہلکی — شمعیں سحر کو جیسے محفل میں جھلملائیں
کرنیں گرا رہا ہو یوں چاند اُجلی اُجلی — پانی میں جیسے شب کو پریاں نہانے آئیں
لب پر نہ ہو پپیہے کے شورِ پی کہاں کا — مرغانِ خوشنوا کی خاموش ہوں صدائیں
عالم سکوتِ شب کا چھایا ہوا ہو ہر سو — اور چل رہی ہوں بھینی بھینی خنک ہوائیں
خلدِ بریں سے لیکر پھولوں کا آہ زیور — دلھن تجھے بنانے کو آئیں اپسرائیں
آواز ہو سریلی اور انکھڑیاں نشیلی — دھیمے سروں میں تیری عظمت کے گیت گائیں

میں کاش چاندنی میں دیکھوں بہار تیری
دلکش عجیب ادا ہے اے رودبار تیری

ہے دلفریب سنگم تیرا عجیب منظر — دو بہنیں رو رہی ہیں رونا خوشی کا مل کر
جمنا کے ہیں گلے میں گنگا کی آہ باہیں — گنگا سے رو رہی ہے جمنا لپٹ لپٹ کر
یہ ہمکنار اُس سے وہ اس سے ہم بغل ہے — دونوں نثار کرتی ہیں آنسوؤں کے گوہر
بچھڑی ہوئی تھیں کب کی کیا جانے دونوں بہنیں — آنسو نہیں جو تھمتے ہیں جوشِ غم سے دم بھر
بہنے دو انکو یکجا دونوں ہیں بہنیں بہنیں — ان کو جدا نہ کرنا اے چرخِ تفرقہ گر
ان کے ملاپ میں ہے اک اتحادِ دلکش — اور اتحاد میں اک شانِ وفا ہے مضمر
شانِ وفا میں ہے اک اندازِ دلفریبی — دامانِ حسن ہیں وہ پھیلے ہوئے زمیں پر

ہم دوش ہو رہے ہیں جیسے یہ دونوں دریا
یا رب ہو وصل تیرا یوں ہی مجھے میسر
پردا دوئی کا یعنی اُٹھ جائے درمیاں سے
تیرے لیے بتوں میں بے گانہ اک جہاں سے

---

## یادِ طفلی[1]

کدھر گیا آہ میرا بچپن نجات تھی جب غم جہاں سے
نہ دل تھا حسرت کش تمنا نہ تھی زباں آشنا فغاں سے

کہاں گئی وہ بہار طفلی کدھر گئے وہ نشاط کے دن
گلاب سا آہ میرا چہرہ نہ زرد تھا جب غم خزاں سے

کبھی تھا کوئل کا ہم نوا میں کبھی تھا میں ہم سرود قمری
چمن میں کرتا تھا چھیڑ پہروں میں جا کے مرغان نغمہ زا سے

میں دل میں خوش تھا کہ گا رہی ہے میری محبت کا یہ ترانہ
کھلا نہ تھا راز عشق گل کا جو مجھ کو بلبل کی داستاں سے

بہت دنوں ہم صفیر تیرا رہا ہوں بچپن کی صحبتوں میں
ہزار نغمے سنا کیا ہوں میں او پپیہے تری زباں سے

بہائیں کاغذ کی میں نے ناویں بہت لب جو بنا بنا کے
برس گئی کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی جھڑی جو ساون کی آسماں سے

کبھی شگوفوں کو چومتا تھا کبھی تھا کلیوں کو پیار کرتا
نثار میں بھی تھا آہ بلبل ادائے گل پہ ہزار جاں سے

چمن کے سبزے پہ تیرے نیچے میں تو پڑا کیا ہوں برسوں
کہ جیسے چھوٹے خدنگ خارا شگاف کوئی کڑی کماں سے

کبھی تمنا کہ چاند کو میں گھر اپنے لاؤں بنا کے مہماں
کبھی یہ حسرت کہ توڑ لاؤں میں جا کے تاروں کو آسماں سے

وہ شوق افزا عجب تھیں راتیں میں جب اچکتا تھا توڑنے کو
اگرچہ اونچے بہت ستارے تھے دست و بازو تھے ناتواں سے

کبھی جو آئینے میں یکایک نظر پڑی مجھ کو اپنی صورت
رہا ہوں پہروں میں محو حیرت کہ پیاری شکل آ گئی یہ کہاں سے

لبوں پہ بچپن کی کیا نہ آئے گی اب وہ معصوم مسکراہٹ
ادھورے الفاظ اے جوانی وہ کیا نہ نکلیں گے اب زباں سے

نسیم دینے کو مجھ کو لوری نہ شام فرقت میں آئے گی کیا
پتنگ کے کاٹے اڑیں گے کب تک ہوا میں آ کر شرر فشاں سے

بتوں کے تیر نظر کا بسمل نہ تھا خوشا روزگار طفلی
نہ لاگ شہ رگ کو نیشتر سے نہ چھیڑ بھالے کو تھی سناں سے

نہ دل کو فکر معاش کا غم نہ مرگ احباب کا تھا ماتم
لہو کے آنسو نہ آہ راتوں کو تھے رواں چشم خونفشاں سے

---

[1] مخزن - اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء صفحہ ۵۹ تا ۶۱

نہیں تھی گرانباری مشاغل نہ تھی یہ پابندی علائق | اسیر زنجیر غم نہ تھا میں تمام تھی شورش جہاں سے
جگر پہ پیری کے نشتر ہائے کرخت پڑتے تھے تیغ بنکر | شہید تشنیع اقربا تھا نہ برشِ رشتۂ زباں سے
میں مثل حباب دل تھا خوش خلق مرے کھلونے تھے چاند سورج | اتار لاتا تھا جا کے تارے زمیں پہ تو تکو آسماں سے
مرا گھروندا تھا گھر کا آنگن اسی میں جہاں تھا میرا بچپن | مجھے بلایا تھا کس نے ظالم شباب تو آ گیا کہاں سے
ہے جو تو اے شباب مہمان یا پر غم و رنج و یاس و حرماں | مجھے توقع نہیں ہے یہ بھی طلسم نیرنگی جہاں سے
ابھی ہے نیر انتشار باقی ابھی بڑھاپا ہے آنے والا | فلک کو لینے ابھی ہیں بدلے بہت سے اک جزو ناتواں سے

ہزار جھگڑے ہیں زندگی کے ہزار دنیا کے ہیں بکھیڑے
سر و صدمے اٹھیں تو کیونکر اٹھیں یہ اک مشت استخواں سے

# علی محمد شاد عظیم آبادی

## مسدس نظم

یہ چند روزہ جہاں درس گاہ ہے پیارے | علوم و فضل کے طالب ہیں مرد و زن سارے
کرو مطالعہ بیٹھو نہ ہمتیں ہارے | جہالتوں کے نہ باندھو کمر پہ پشتارے

کمی نہیں نگۂ عقل میں بصارت کی
پڑھو پڑھو کہ کھلی ہے کتاب فطرت کی

ذرا تو سوچ کہ تو کیوں جہاں میں آیا ہے | خدا نے کس لئے انساں تجھے بنایا ہے
کر اس پہ غور کہ کیوں کر نقش بٹھایا ہے | پیمبروں کے صحیفوں نے کیا بتایا ہے

اٹھی ہے ہستیٔ انساں میں پھر تو اصلا تو
اسی کو تو نے نہ سمجھا تو کچھ نہ سمجھا تو

بشر ہیں سب تیرے ہم جنس سب سے الفت کر    محبتوں میں ہیں کل نیکیاں محبت کر
ہلا نہ عرش خدا دل نہ توڑ عبرت کر    خود اپنی راہ میں کانٹے نہ بو مروت کر
تری خطا کا تری روح سے عوض لینگے
یہ عارضے تجھے مرنے کے بعد دکھ دینگے

گناہ جتنے ہیں وہ سب ہیں عارضے بہ یقیں    بچ ان سے تا نہ تری روح مبتلا ہو کہیں
فنا کے بعد عدم میں جو ہو گا جا کے مکیں    یہ عارضے تجھے سب مل کے گھیر لینگے وہیں
یہ کوفت تا بہ قیامت ستائیگی تجھ کو
عدم میں کل کسی کروٹ نہ آئیگی تجھ کو

ہمیشہ چاہیئے اے دوست اکتساب کمال    وہ کام کر کہ نہ ہو جس کو احتمال زوال
اگر ہے جو ہر ذاتی کی ارتقا کا خیال    گذار دے اسی اک دھن میں عمر کے مہ و سال
دریغ اس میں نہ کر کام آئے گو سر تک
وہ نقش کھینچ کہ مٹنے نہ پائے محشر تک

نمود و نام کی خواہش تری نہیں ہے مگر    ریا نہ کر کہ ریا میں ہیں سو طرح کے ضرر
یہ پالسی جو زمانے میں آج کل ہے ہنر    ہے مکر و کذب خدا کے لئے کر اس سے حذر
مدام کوشش و کاوش رہے طہارت میں
لگے نہ داغ تری روح کی شرافت میں

خلاصہ یہ ہے کہ بچتے رہو رذائل سے    کرو نفوس کو آراستہ فضائل سے
رہے یہ فکر کہ کیونکر خودی مٹے دل سے    ہمیشہ چاہیئے [illegible] فضائل سے
نگو ہم از تو ازیں بیش کاین بکن آن کن
بفہم مصلحت خویش و کار آسان کن

## غزل ؎۱

نہ آئینے کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں ۔۔۔ حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں
ہنسانا اور رلانا ہو فنا دنیا کی خصلت ہے ۔۔۔ ہم اس انداز کو اندازِ معشوقانہ کہتے ہیں
ہمارا اور واعظ کا کبھی چک جائیگا قصہ ۔۔۔ وہ دیوانہ ہمیں اور ہم انہیں دیوانہ کہتے ہیں
چھپاؤ لاکھ پر صورت پرستی سے نہیں خالی ۔۔۔ جو ہیں اہلِ نظر کعبہ کو بھی بت خانہ کہتے ہیں
تعلق لاکھ ہو پھر بھی جہاں سے بے تعلق ہو ۔۔۔ اسی کو تیرے عاشق ہمتِ مردانہ کہتے ہیں
ریائی بزم میں اے محتسب گوشے بہت سے ہیں ۔۔۔ انہیں گوشوں کو شاید شیخ خلوت خانہ کہتے ہیں

# پیارے لال شاکر میرٹھی

## موسمِ سرما ؎۲

یہ سہانا سبزہ زار اور ٹھنڈی یہ ہوا ۔۔۔ موسمِ سرما کی بھی کس درجہ دلکش ہے فضا
یہ وہ موسم ہے کہ جس میں ہے عجب لطفِ بہار ۔۔۔ پھول پانی میں شگفتہ ہیں کنول کے جا بجا
ٹہنی ٹہنی جھک گئی ہے سجدۂ شکرانہ میں ۔۔۔ کچھ عجب دلکش ہے بیلوں کے درختوں کی ادا
او چہکتے پھرتے ہیں چکور اف رے جوشِ انبساط ۔۔۔ اور ہیں سرگرمِ ترنم طائرانِ خوشنوا
اجلی اجلی کانس بنکر دشت میں ریشِ سفید ۔۔۔ دیتی ہے برسات کی پیرانہ سالی کا پتا
جب سے بدلی ہے بساطِ دہر نے اپنی روش ۔۔۔ آسمان پر جب سے نکلا ہے سہیل خوشنما
راستوں کا ہو گیا ہے خشک پانی اس طرح ۔۔۔ جیسے استغنا بتلائے حرصِ دنیا کو ہوا
اب نہ کیچڑ کا نشاں ہے اور نہ ہے گرد و غبار ۔۔۔ پیاری رُت ہے اور سہانی ہے زمیں یوں واہ وا

؎۱ ادیب۔ الہ آباد۔ اگست ۱۹۱۱ء۔ صفحہ ۹۲ ؎۲ ادیب۔ الہ آباد۔ ستمبر ۱۹۱۱ء صفحہ ۹۰-۹۸

جس طرح دلکش کسی کا دورۂ انصاف ہو | عدل گستر ہو رعیت پر کوئی فرماں روا
صاف ستھرا یوں ہے تالابوں کا پانی جسطرح | قلب صافی ہو کدورت سے کوئی ناآشنا
بادلوں کے اب وہ ٹکڑے ہیں نہ وہ ابر سیاہ | اب نہ وہ ساون کے جھالے ہیں نہ وہ کالی گھٹا
اب ہے مطلع آسماں کا صاف یوں جسطرح ہو | پاک دنیا کی ہوس سے قلبِ مردِ باخدا
ہو چلا پانی جو چھوٹے چھوٹے چشموں میں ہے کم | مچھلیوں کا اضطرابِ دردِ دل بھی بڑھ چلا
جیسے ہو کم مائگی سے آہ کوئی خانہ دار | فکرِ روزی میں غریقِ لجۂ بیم و رجا
اب بھی پڑ جاتے ہیں یوں دو چار چھینٹے گاہ گاہ | جیسے ہو صرفِ کرم کوئی تلون آشنا
مچھلیاں یوں گہرے پانی میں مگن ہیں جسطرح | عابدوں کے دل کو اطمینان کامل ہو عطا
جوشِ غم سے مضطرب سرخاب کا جوڑا ہے یوں | گو ہے نظارہ سوادِ دشت کا تسکین فزا
دیکھ کر غیروں کی دولت کو وفورِ رشک سے | جس طرح آزردہ ہو کوئی حسودِ ناسزا
پیاس کے مارے پپیہا یوں ہے سرگرم خروش | نالہ کش ہو جیسے کوئی منکرِ ذاتِ خدا
ٹھنڈا ٹھنڈا چاند گرمی کی حرارت کے لئے | کر رہا ہے اس طرح جاڑے کی راتوں کو جدا
دور کر دے دل سے اوہامِ پریشاں یک قلم | فیضِ صحبت سے کوئی جس طرح رہبر راہنما
چاندنی نکھری ہوئی ہے اور چکوروں کا گروہ | ٹکٹکی باندھے ہوئے یوں چاند کو ہے تک رہا
جیسے ہوں قدرت میں محوِ جلوۂ دیدارِ حق | عابدانِ باخدا و زاہدانِ بے ریا

واہ جاڑے کا بھی موسم کیا نشاط انگیز ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی روح پرور ہے عجب بادِ صبا

## فضائے برشگال[۱]

بناکے حسن کی دیوی عروسِ فطرت کو | سجا دیا ہے گلوں نے فضا کی وسعت کو

---

۱ نیچرل شاعری۔ مؤلفہ صفدر مرزا پوری۔ بار اول۔ لکھنؤ صفحہ ۴۱-۴۲

رنگیلی کلیوں کا رس چوس چوس کر بھنورے
لبوں سے گھولتے ہیں شہد کی حلاوت کو

ہر ایک شجر پہ نئی کونپلیں نکل آئیں
سجا رہا ہے ہر اک پھول اپنی خلوت کو

فروغ ابر سیاہ کا ہے اس طرح جیسے
بقا نہ ہو کسی کم ظرف کی محبت کو

زمیں پہ جھک کے برستا ہے ابر یوں جیسے
سخی جھکے کوئی وقت کرم سخاوت کو

گیاہ سبز میں راہیں نہاں ہیں یوں جیسے
چھپائے ابر گنہ آفتاب عصمت کو

زمین سے گرد ہے یوں صاف جسطرح دلمیں
جگہ نہ دے کوئی اہل صفا کدورت کو

رواں ہیں دامن صحرا میں اس طرح نالے
کہ طے کرے کوئی سالک رہ حقیقت کو

زمین کو سبزۂ صحرا سے یوں ہے آرائش
کسی سخی کی ہو جیسے فروغ دولت کو

گھٹا میں شب کو چمکتے ہیں اس طرح جگنو
سجائیں جیسے چراغاں سے بزم عشرت کو

دکھائی دیتے نہیں اب ستم زدہ مرغاب
کسی ندی کے کنارے پہ شام فرقت کو

نکل کے دشت سے یوں باد تند کے جھونکے
اڑائے پھرتے ہیں گردوں پہ ابر رحمت کو

کہ خاندان میں جس طرح ناخلف اولاد
لٹائے اپنے بزرگوں کی مال و دولت کو

# پادری احمد شاہ صاحب شائق
## وکیلوں کی

کسو جا پر چلے لاٹھی تو بن آئے وکیلوں کی
کہ حاجت ہوتی ہے دعوی کو قانونی دلیلوں کی

حقیقت پر وکالت اس طرح چھا جاتی ہے انکی
سر آب مصفّا جسطرح کائی ہو جھیلوں کی

عدالت میں حقانیت کی پتنگیں چڑھانے انکی بیانا ہی ہے
اڑانا جانتے ہیں یہ پتنگیں خوب ڈھیلوں کی

اگر جیتیں تو لیں پھر محنتانہ اور شکرانہ
مگر ہارے ہوئے کے سر چپت ماریں اپیلوں کی

ملہ اپنی بیاض میں سے صاحب ممدوح نے مؤلف کو چند نظموں کے انتخاب عطا فرمائے تھے یہ نظم ان میں سے ہیں ٭

## ریل

اِک اِک پڑا ہو ٹوٹا اِک اِک سرا اُجاڑی
جاری ہوئی ہے جب سے کم بخت ریل گاڑی

پٹڑی بچھا بچھا کر سب کا کیا ہے پٹڑا
جو اُس کے آگے آیا ہو باغ یا کہ باڑی

پڑتا لو جانچو اِس کی درآمد و برآمد
تاجر بنا ہے انگلینڈ اور ہند ہے کباڑی

## ھمز ولڈر

اُٹھے گا آہ کا اپنی دُھواں جب دل کی چمنی سے
تو بیٹی کے عوض نکلیگا نالہ رل کی چمنی سے

سیاسی بن ہیں کالے اوس آزادی کی چاٹینگے
اجالا امن کا ہو مار سیاہ کی بل کی چمنی سے

یہ کیا اندھیر ہے سرمایہ دار آپ اور ہم مفلس
ہو بزم اپنی بھی روشن آپ کی محفل کی چمنی سے

جلا کر خاک کر ڈالا بدن سوز مشقت سے
جلے ہم روشنی کرنے کو پیدا گل کی چمنی سے

---

اُنہیں لنجا اپاہج کر دیا ہے کارخانوں نے
ابھی دنیا کا دیکھا کچھ نہ تھا جن نوجوانوں نے

مینیجر روم میں اپنے سفیدی اس سے کروالیں
تہیا پیس کے چونہ کر دیا ہے استخوانوں نے

## ممبری کا مرض

ہار پہ تو قہقہہ اور جیت پر تالی ہوئی
ممبری بھی کیا ہوئی مرغوں کی اک پالی ہوئی

قوم کی جھوٹی وکالت ہے نمائش کیلئے
ورنہ غایت درجہ یہ بکواس نقالی ہوئی

کثرت آرا نہ پائی لٹ گئے بڈھو میاں
جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں بدحالی ہوئی

نفع مخفی کی خدا جانے مگر ظاہر ہے یہ
جوتیاں بھی گھس گئیں اور جیب بھی خالی ہوئی

## مزدور

"تنازع بال بچوں میں میاں بی بی میں اَن بن ہے
نہ کھانا ہے نہ کپڑا ہے نہ گھر میں کوئی باسن ہے

جلانے کو وہ برتن جو ملے ہیں کیا ہم ہاتھ پیر اپنے
نہ لکڑی ہے نہ کنڈے ہیں نہ اُپلے ہیں نہ ایندھن ہے

شب تاریک میں اپنا پرایا کس طرح سُوجھے
نہ کُپّی ہے نہ ڈِبّی ہے نہ بتّی ہے نہ روغن ہے

پڑا ہے بھاڑ سا گھر اور سر پر آ گئی ہولی
نہ گوبر ہے نہ پیلا ہے نہ مٹّی ہے نہ بیسن ہے

جو میلے ہو گئے کپڑے تو ان کو کسطرح دھوئیں
نہ سوڈا ہے نہ کھارا ہے نہ سجّی ہے نہ صابن ہے

یہ روکھی روٹیاں منہ میں نہیں دُھنستیں تو کیا کیجیے
نہ گھوئیاں ہے نہ آلو ہے نہ کدّو ہے نہ بیگن ہے

بندھی رہتی ہے بھوکی گائے کھونٹے سے قصائی کے
نہ بھوسہ ہے نہ بھُوسی ہے نہ چوکر ہے نہ ٹھّبکن ہے

وہ ننگی بوچی ہے نسیا بھی کیا گہنوں میں گہنا ہے
نہ بالی ہے نہ پتّا ہے نہ نتھنی ہے نہ ٹکن ہے

جو خالی پیٹ ہے چوہے قلابازی نہ کیوں کھائیں
نہ روٹی ہے نہ سالن ہے نہ ستّو ہے نہ چربن ہے

پڑا ہے سابقہ ننگوں سے جورو کیوں نہ ہو ننگی
نہ لہنگا ہے نہ گھگھرا ہے نہ دھوتی ہے نہ جھارن ہے

میاں کو رل کی مزدوری میں یہ برکت نظر آئی "
نہ کوڑی ہے نہ پیسہ ہے نہ روپا ہے نہ کُندن ہے

## شبلی

### مذہب یا سیاست[۱]

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو
وہ ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار

یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں
کر دیا ذرّۂ افسردہ کو ہم رنگ شرار

۱ کلیات شبلی - معارف پریس اعظم گڑھ - صفحہ ۵۳-۵۴-۵۵

ہے یہ وہ قوتِ پرزور کہ جس کی تکرار
سنگ خارا کو بنا دیتی ہے اک مشتِ غبار

اس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیادِ زمیں
اُس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراقِ دیار

یہ اُسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے
کھیلنے جاتے تھے ایوان کہ کسریٰ میں شکار

وہ الٹ دیتے تھے دنیا کا مرقع دم میں
جن کے ہاتھوں میں رہا کرتی تھی اونٹوں کی مہار

اُس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم
بن گئی دھر میں جا کر چمن آرائے بہار

یہ اُسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن
فاش کرنے لگے جبریلِ امیں کے اسرار

یا کوئی جادو ہے ملک و وطن تھا جس نے
کر دیئے قوم میں قوائے عملی سب بیدار

ہے اسی مے سے یہ سرمستی احرارِ وطن
ہے اسی شئے سے یہ گرمیٔ ہنگامہ کار

آپ دونوں سے کئے دیتے ہیں ہم کو محروم
نہ سیاست ہے نہ ناموسِ شریعت کا وقار

مدتوں بحثِ سیاست کی اجازت ہی نہ تھی
کہ وفاداریٔ مسلم کا تھا یہ خاص شعار

اب اجازت ہے مگر دائرۂ بحث ہے یہ
کہ گورنمنٹ سے اس بات کے ہوں عرض گذار

ہم کو پامال کئے دیتے ہیں ابنائے وطن
ڈر ہے پس جائے نہ یہ فرقۂ اخلاص شعار

یہ بھی اک گونہ شکایت ہے غلاموں کو ضرور
کہ مناصب میں ہے کم حلقہ بگوشوں کا شمار

اب رہا جذبۂ دینی تو وہ اس طرح مٹا
کہ ہمیں آپ ہی آتا ہے اب اس نام سے عار

وضع میں طرز میں اخلاق میں سیرت میں کہیں
نظر آتے نہیں کچھ حرمتِ دین کے آثار

آپ نے ہم کو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم
اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار

بحث یہ ہے کہ وہ اس طرز سے بھی ممکن تھا
کہ نہ گھٹتا کبھی ناموسِ شریعت کا وقار

ہم نے پہلے بھی تو اغیار سے سیکھے تھے علوم
ہم نے پہلے بھی تو اس نشہ کا دیکھا ہے خمار

نام لیتے تھے ارسطو کا ادب سے ہر چند
تھے فلاطونِ الٰہی کے بھی گوش گذار

جانتے تھے مگر اس بات کو بھی اہلِ نظر
کہ حریفوں کو نہیں انجمنِ خاص میں بار

ابھی یہ بادۂ عرفاں کے نہیں ذوق شناس
بزمِ اسرار کے یہ لوگ نہیں بادہ گسار

آج ہر بات میں ہے شان تفرنج پیدا　　آج ہر رنگ میں یورپ کے نمایاں ہیں شعار

ہیں شریعت کے مسائل بھی وہیں تک محدود

کہ جہاں تک انہیں معقول بتائیں اغیار

# کُندن لال شر رسہارنپوری

## گوپی چند[1]

کبھی ہندوستاں جنت نشاں کیا رشکِ جنت تھا　　تقدس میں تھا یکتائے جہاں کانِ لطافت تھا

یہاں کا ذرہ ذرہ آفتابِ نورِ حکمت تھا　　ہر اک فردِ بشر دلدادہ حسنِ حقیقت تھا

ہوئے بیہوش موسیٰ طور پھونکا برقِ رخشاں نے

مجسم ہو کے یاں جلوہ دکھایا نورِ پنہاں نے

ہر اک انساں کی پاکیزہ سیرت نیک طینت تھی　　مقدس اور مبارک عورتوں مردوں کی خصلت تھی

فقیروں کی شہنشاہوں سے بڑھکر شان عظمت تھی　　یہاں کے بادشاہوں کی فقیرانہ طبیعت تھی

سمائیں سازو برگِ جاہ و حشمت کیا نگاہوں میں

یہاں اک ہستیِ موہوم ہو دنیا نگاہوں میں

روایت ہے کہ گوپی چند اک سلطانِ ذیشاں تھا　　خوش و شاداب ملک اس کا جسکے زیرِ فرماں تھا

رعیت پروری انصاف میں بے مثل و دوراں تھا　　فضائل میں ملائک سے بھی افضل تر وہ انساں تھا

ابھی مشہور حکایات ہیں وہ دھوم اس کے عہدِ شاہی کی

ہر اک سو شہرتیں دنیا میں تھیں عالم پناہی کی

مہاراجہ کا اک فرزند جلندر نام دلدادہ تھا　　طرب انگیز دارالسلطنت میں جوشِ عشرت تھا

---

[1] رسالہ [illegible] الہ آباد جنوری ۱۹۱۰ء [illegible]

عیاں اُس روز خورشیدِ سحر سے نورِ فرحت تھا | خوشی کا دَور تھا ہر سمت سامانِ مسرت تھا

ہوا تھی فرح بخشِ جاں نسیمِ خرّمی بن کر
نشاط انگیز تھا آبِ رواں موجِ خوشی بنکر

مہاراجہ نے پھر غسل کی جب جلوہ فرمائی | ادب کے ساتھ غازہ لیکے آئی شانِ رعنائی
لطافت بنکے پانی میں ملی خوبی و رعنائی | صفائی تھی بہ آب و تاب محوِ حسن افزائی

ادائیں دیکھ کے بیٹے کی بھولی صورت کی
دلِ مادر پہ اس نظارہ نے برپا قیامت کی

خدا جانے خوشی نے کیا کیا الٹا اثر پیدا | خیالاتِ غمِ افزا سے دگرگوں ہو گیا نقشہ
اُمنڈ آیا کلیجہ آہ! قابو میں کہاں دل تھا | نکل ہی آئے آنسو گو بہت کچھ ضبط نے روکا

لبِ بام ایک غرفے میں کھڑی تھی مادرِ سلطاں
گرے نورِ نظر پر اشکِ گرمِ دیدۂ گریاں

عجب عالم تھا گوپی چند کا حیراں طبیعت تھی | دریچہ کی طرف دیکھا تو ماں کی غیر حالت تھی
اُداسی چھائی تھی چہرہ پہ اور غمگین صورت تھی | یہ حالت دیکھ کر کب ضبط کی بیٹے میں طاقت تھی

اُسی حالت میں جا کر ماں سے رونے کا سبب پوچھا
ادب سے موجبِ غم باعثِ رنج و تعب پوچھا

کہا دل تھام کر مینا وتی نے سوزِ پنہانی | فنا ہو جائے گی یہ کائناتِ عالمِ فانی
بہارِ نوجوانی کی سمجھ کچھ روز مہمانی | نہ ہو گا چاند سی صورت پہ تیری حسنِ نورانی

یہ جسمِ خوبصورت ایک دن ہے خاک ہونے کو
مقرر وقت ہے ہستی کا قصہ پاک ہونے کو

عبث عمرِ دو روزہ پر خیالِ جاہ و حشمت ہے | بقا جس کو نہیں اُس چیز سے ناحق محبت ہے
جہانِ بے وفا میں ہیچ فکرِ مال و دولت ہے | مہاراجہ ہوں میں یہ سب اقتدار [illegible] ہے

کہاں ہے باپ تیرا جس نے برسوں بادشاہت کی
سناتے تھے خوشی سب اسکے بھی روز ولادت کی

کہاں کا تاج مارو لات تختِ بادشاہت پر
وہی انجام بیں ہے خاک ڈالے جاہ و حشمت پر
وہی سرور والم ہے نہ بھولے عیش و عشرت پر
وہ ہے انساں نظر جسکی ہو یکساں رنج و راحت پر

مٹا کر ہستیٔ فانی نشانِ بے نشاں پائے
تمنّا ہے یہ میری تو حیاتِ جاوداں پائے

اثر دل پر پڑا جادو بھری تقریر کا ایسا
ہُوا القصہ گوپی چند گورکھ ناتھ کا چیلا
گلے میں ڈال لی کفنی سنبھالی ہاتھ میں مالا
خدا کی شان ہے دم بھر میں جوگی ہوگیا راجہ

حقیقت کھُل گئی جب اس جہانِ بے حقیقت کی
تعلق ہائے دنیائے دنی سے قطع الفت کی

گُرو کا واجب التعمیل یہ ارشاد اول تھا
کہ جس کو سُن کے ہر فرد بشر کا دل تڑپ اُٹھا
ادا اس طرح سے کرنا ہے فرض اولیں اپنا
محل سے رانیوں کے مانگ لاؤ بھیک کا ٹکڑا

غرورِ بادشاہی سر سے تا یکسر نکل جائے
فقیری کا قدم راہِ حقیقت پر سنبھل جائے

وہ کشکولِ گدائی ہاتھ میں لیکر وہاں پہونچا
صدا دی بھیک دینا مائیو سب کا بھلا ہوگا
اثر آواز نے پیدا کیا شورِ قیامت کا
فغاں و نالہ سے رنواس میں کہرام تھا برپا

ہر اک رانی مجسّم صورت تصویر ماتم تھی
سراسر روح فرسا دل پہ طاری حالت غم تھی

یہاں سے چل کے مانگی بھیک ماں کے آستانہ پر
تہ دل سے دعائیں ماں نے دیں بیٹے کو خوش ہوکر
مبارک ہو لباسِ فقر تجھکو اے خرد پرور
گدائی اسکے کوچے کی شہنشاہی سے ہے بہتر

وزیروں کے یہاں بھی بھیک مانگی جاکے سلطاں نے

مٹائی نخوتِ شاہی یہاں تک شاہِ ذیشاں نے

غرض صحرا کی جانب شہر سے اُس نے عزیمت کی | غم و افسوس سے ناگفتہ بہ حالت تھی خلقت کی
اسے پروانہ تھی مطلق کسی کے رنج و کلفت کی | وہاں کا یا پلٹ ہی ہو چکی تھی قلبِ ماہیت کی

حباب آسا مِلا تھا ٹوٹ کر بحرِ حقیقت میں
بسر کی عمر گوپی چند نے زہد و عبادت میں

# بنواری لعل شعلہ حصاری

## بزمِ برنداین[1]

جو دیکھا گوپیوں کو ہوش پامال | مخاطب ہو کے بہرِ پرسشِ حال
سری جد پتی نے پوچھا کیوں ہو بیتاب | بتاؤ کیا ہے سببِ سیرِ مہتاب
کیا بے چین کس کی آرزو نے | نکالا گھر سے کس کی جستجو نے
ہے کس رازِ نہاں کی پردہ داری | ہے کس مطلب کی دل میں بیقراری
یہ کس آئینے کی حیرانیاں ہیں | یہ کس حیرت کی بے سامانیاں ہیں
ہے کس افسونِ دل بُروی کی تاثیر | لگے ہیں کس نگاہِ شوخ کے تیر
یہ کس جوشِ محبّت کا ہے طوفاں | یہ کیوں چاکِ گریباں کے ہیں ساماں
کھُلی ہو کس کے اسرارِ نہاں پر | مٹی ہو کس کے حسنِ بے نشاں پر
حریفِ عشق ہے ظاہر پرستی | ہے بہرِ عکس آئینے کی ہستی
یہ کیوں ہے دلنشیں عشقِ خط و خال | کہ ہو آئینہ ساں مشتاقِ تمثال
تغافل ہے یہ ہشیاری نہیں ہے | اگر خود دل کی خود داری نہیں ہے

[1] کلیات شعلہ - بار اول - علی گڈھ سنہ ۱۹۱۴ء - بزمِ برنداین - صفحہ ۱۸ تا ۲۱

بحکمِ وید و رسم و راہِ عصمت
خلافِ مصلحت یہ بے بسی ہے
غلط ہے گر سرِ دل بستگی ہے
اگر میرے لئے ہے دشت گردی
حقیقت پر اگر ہے عشق مائل
تلاش و فکر لاحاصل سعی ہے
تماشا ہوں سرِ راہِ حقیقت
قریں ہوں دل سے دل کی آرزو سے
بظاہر برج میں ہوں یا کہیں ہوں
نہیں ہے وصیان میرا مجھ سے کچھ کم
سوارِ ناقہ ہوں نے زیبِ محمل
تصور ہی سے دل رشکِ چمن ہے
مجھے ہر چشمِ نم جمنا کا تٹ ہے
نظر میں ہے اگر حسنِ حقیقت
یہی چھب دل میں بھی بانکی ہے میری
یہاں اک ناز سے پیشِ نظر ہوں
کھلیں دل جس طرح پھولوں کی کلیاں
بظاہر ہوں اگرچہ آب و گل میں
قریب و دور دونوں میں ہوں معمور
عیاں ہوں اپنے حسنِ برملا سے
زمین و آسماں ہیں پردۂ راز

رضا جوئی شوہر ہے عبادت
مناسب سوئے خانہ واپسی ہے
کرشمۂ بوئے گل خود رفتگی ہے
تو ہے شرطِ جنوں کچھ پامردی
نہیں ہے تنگ راہِ کوچۂ دل
بہارِ عشق رنگِ بے خودی ہے
مقید ہوں نہ پابندِ طریقت
نہیں ملتا ہوں لیکن جستجو سے
ہر اک دل میں مگر خلوت نشیں ہوں
کہ دل ہے جلوہ گاہِ ہر دو عالم
ہمیشہ ہوں مقیمِ کوچۂ دل
جو دل میں ہوں تو دل ہی برج بن ہے
مجھے ہر رخنۂ دل بنسی بٹ ہے
ہر اک پہلو ہے میرا کنجِ خلوت
جھکے گر دل تو پھر جھانکی ہے میری
ہزار انداز سے واں جلوہ گر ہوں
رنگیں ہو جائیں برندابن کی گلیاں
مجھے پا ہو تو ڈھونڈھو دل ہی میں
قریب ہے ہاں قریں اور دور سے دور
ابد کے بعد اور پہلے ازل سے
دو عالم ہیں مرے بازیگہِ ناز

تصوّر دل میں ہوں صورت نظر میں   تلفظ میں ہوں معنی دل ہوں میں
سمائے مجھ میں میری آرزو مند   نہیں پر ظاہری الفت کا پابند

بنائی تم نے دیوانوں کی گت ہے
یہ بے باکی خلافِ مصلحت ہے

اُٹھی[1] اک مہ جبیں خیلِ بتاں سے   چلی آگے گروہ گوپیاں سے
کیا اظہار حسرت دو بدو ہو   مخاطب سوئے شوخ شعلہ خو ہو
کہ اے آرام جانِ جان عشاق   دل و جان دلربا جیت جور و فراق
تجھے زیبا ہے نازِ بے نیازی   تری بخشش ہے درد جاں گدازی
نہ تھی گر بانسری کو ہم سے کچھ لاگ   لگائی کیوں شبِ مہتاب میں آگ
بلایا کیوں نقا غیبی کی صدا میں   نکالے اب جو سوز سینے حیا میں
لگائی آپ تو نے آگ دل میں   سزا بخشتا ہے درد منفعل میں
سراسر ہیچ ہے عقبےٰ و دنیا   نہیں جز تیرے کچھ تجھ سے تمنّا
سوالِ صبر اسے خود کام تا چند   جواب بوسہ کب ہیں کلمہ پند
ترے ہاتھوں میں اے شوخِ جفا جو   دل سوزاں کی آتی ہے ہمیں بو

یہ شورِ حشر کیا ہے بانسری میں
دل نالاں چھپا ہے بانسری میں



[1] ایضاً صفحہ ۲۰۵ تا ۲۸

# احمد علی شوق

## گل کی بے کلی[1]

نسیم نے مجھے آ آ کے گدگدایا ہے | اسی سے میرے لبوں پر تبسم آیا ہے
یہ میری بُو کو نہ چھوڑے گی میں سمجھتی ہوں | مرے حجاب کو توڑے گی میں سمجھتی ہوں
بنے گی ہاتھ ۔ میرے پیرہن کو کھولے گی | کلید ہو کے یہ قفل دہن کو کھولے گی
اڑے گا عارضِ طفلی سے رنگ نادانی | شگفتگی مری ۔ ہو جائے گی پریشانی
نصیب ہوگا نہ خاطر کو جمع پھر ہونا | کھلائیگا کوئی گل میرا منتشر ہونا
جو میں ہنسونگی تو گلچیں مجھے نہ چھوڑے گا | وہ سلسلہ مری حبّ وطن کا توڑے گا
مری رگوں میں نہ دوڑیگا چڑھکے پھر پانی | نہ کام آئیگی شبنم کی قطرہ افشانی
ہوائے تازہ کو ترسونگی پا سکوں گی کہاں | چمن میں پھر اسے کھانیکو آ سکوں گی کہاں
شجر کی شاخ نہ مجھکو نصیب پھر ہوگی | شعاع مہر نہ میرے قریب پھر ہوگی
کہاں یہ رات کو تاروں کی چھاؤں میں رہنا | جگر چھیدیگا بنوں گی میں ہار یا گہنا
گلے پڑوں گی میں جسکے وہ مَل کے چھوڑیگا | مرے لباس کی رنگت بدل کے چھوڑیگا
یہ آبرو مرے چہرے کی آب ہی تک ہے | بہار حُسن کی رنگ شباب ہی تک ہے
لٹے بہار تو ہو جائے رنگ فق میرا | الٹ پلٹ کے ہو برباد ہر ورق میرا
جفائیں سہنے کو شاید جہاں میں آئی ہیں | ہوئی یہ چوک کہ حس اور جان لائی ہیں
مگر دہن نہ میسر ہوا کہ بول سکوں | جگر کی چوٹ کا پردہ زباں سے کھول سکوں
کہے یہ کون کہ اللہ سے ڈرو او گل چیں | یہ بے زباں ہے نہ اس پر ستم کرو او گل چیں

[1] مخزن ۔ لاہور ۔ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء صفحہ ۶۴

وہ کیا سُنے گا اُسے کوڑیوں کا لالچ ہے
طمع ہے سخت بُری چیز شوقؔ یہ سچ ہے

# سنت رام شوق سیالکوٹی

## دُعائے شوق[۱]

اے خوشگوار ہند سدا تو بسا رہے — تیرے ہر ایک نقش کا نقشہ جما رہے
تیری زمیں میں رونقِ صبح و مسا رہے — قایم تیرے نواح کی دلکش فضا رہے
ہیرا ہے تو وطن تیری عظمت سوا رہے

ہلتی رہیں سدا تیرے پیڑوں کی ڈالیاں — کھیتوں میں لہلہائیں اناجوں کی بالیاں
شام و سحر شفق کی نظر آئیں لالیاں — بادل نے ہوں تنی ہوئی بدلی کی جالیاں
قدرت کا ایک رنگ غرض جلوہ زا رہے

برکھا ہو تیری مزرعِ سرسبز و سبز پر — نکلی ہوں پھول پتیاں شاخِ کنیر پر
پیپل کا ہو درخت کنوئیں کی منڈیر پر — پودے اُگے ہوں آم کے ہر سمت ڈھیر پر
نیچر کی برکتوں کا تماشا دکھا رہے

جامن کے پیڑ پر ہوں عنادل کی ٹولیاں — پپیل نوچ نوچ بولتی ساون کی بولیاں
گھنگھور بادلوں نے رچائی ہوں ہولیاں — جنگل میں بھیگ جائیں عروسوں کی ڈولیاں
اور تو ہنر کہا رہوں گھر اُن کو لا رہے

خوش رنگ نیشکر کی ہوں شاخیں ہری بھری — دل ڈھونڈتی ہو کھیت کی سرسبزی و تری
آئیں نظر کسان کی نظریں خوشی بھری — دل بھر بجائے بانس کی لکڑی کی بانسری

---

[۱] شوق منشیہو لاہور جون سنہ ۱۹۱۷ء صفحہ ۸۶ سے ۸۸ تک

کوٹھے پہ رات میرزا گاتا پڑا رہے گا

بستی ہیں بسکہ فیضِ خدائے کریم ہو گا — فرحت فزائی دمِ بادِ نسیم ہو گا
تا ثیرِ لطف خیزی بوئے شمیم ہو — قدرت دوائے درد الیم و سقیم ہو

اِک رحمتِ خدا کا سدا آسرا ہے

اے ہند خوشنما ہو تیرا ایک ایک گھر — لیتا ہو برکتوں کا مزا ایک ایک گھر
کرتا ہو راحتوں کو سوا ایک ایک گھر — دیتا ہو کلفتوں کو مٹا ایک ایک گھر

الطافِ ایزدی کا ترے ہاں قرار ہے

کیا کیا ہیں دلپذیر تیری یہ نشانیاں — سایہ کے پار دھوپ کی آتش فشانیاں
زیرِ درخت مرغ کی توحید خوانیاں — آتی ہوں کاش مجھکو بھی شیوہ بیانیاں

کیا کیا ہیں ولولے بھرے دل میں سما رہے

چلتی سحر نسیم طرب زا وزاں وزاں — تھرا کے کانپتی ہوئی کیکر کی ٹہنیاں
جھاڑی کی گھاس کرتی ہوئی مشک ریزیاں — پھولی ہوئی پھلاہ کی سرسبز پتیاں

ننھے پرند اُڑتے ہوئے چہچہا رہے

کھیتوں میں رات چاند کی خوشرنگ چاندنی — شفاف و صاف صاف و بلا زنگ چاندنی
ظلمت کیسا تنگ کرتی ہوئی جنگ چاندنی — سبزے کو دیکھ ہوتی ہوئی دنگ چاندنی

ٹھنڈک کے لطف کشت و خیاباں کو آ رہے

اے ہند تو عزیز ہے مجھکو جہاں سے — الفت ہے مجھکو تیرے زمیں آسماں سے
کرتا ہوں رات دن میں دعا لامکاں سے — راحت نصیب شوق ہے تیرے وہاں سے

جب تک جیئے زباں پہ تیرا ماجرا رہے

# چندی پرشاد شیدا دہلوی

## کرشن کی بنسی

سچ بتا اے شیام کی بنسی جو تو ہے سحر ساز | آگئیں تجھ میں کہاں سے یہ صدائیں دلنواز
ہوگیا ہے کس لبِ رنگیں سے تیرا ساز باز | کچھ نہیں کھلتا ترے اس نغمۂ دلکش کا راز

ظاہری آرائشوں سے سر بسر کوری ہے تو
کہنے سننے کو فقط اک بانس کی پوری ہے تو

جس کے کانوں میں پڑی بے ساختہ کی دل نے آہ | وہ رسیلی دھن تیری میٹھے سروں میں واہ وا
آگیا منہ کو کلیجہ ہوگئی حالت تباہ | سُدھ بھلا دی اپنے آپے کی تری دیکھی وہ چاہ

کون سے خطے کی اے لیلیٰ تو مجنوں کیش ہے
سننے والوں کا تری آواز سے دل ریش ہے

بھر دئے ہیں کس نے نشتر تیری ہر آواز میں | برچھیوں کے ہیں چلن سارے تیرے انداز میں
ہر رگِ جاں مضطرب دیکھی نوائے راز میں | دل تڑپ جاتے ہیں تیرے سوز کے ہر ساز میں

تیر سی تیری صدائیں کیا جگر کے پار ہیں
خنجرِ براں نہیں ہے تلوار کی یہ دھار ہیں

مست ہو کر جھومتے ہیں کیا ہر اک پیر و جواں | بندھ گیا ہے چار سُو اک دلبری کا سماں
بیخودی میں ایک سے ہیں دونوں زمین و آسماں | ہوش اپنا ہے کسے باقی نہیں ہے تن میں جاں

کھینچ لی ہے جان رگ رگ سے تیری آواز نے
کر دیا ہے محو اک عالم صدائے ناز نے

---

سلہ شیو شمبھو۔ لاہور۔ ستمبر ۱۹۱۷ء۔ صفحہ ۵۴ سے ۵۸ تک

ہو گئے سُن سنتے ہی آواز سارے ہوشیار | تیرے پردے کی صدا نے کر دیئے سینے فگار
زہ سے کانوں کی دل میں ہو گئی ناوک گذار | اک جہاں بچین سے ہے یہ دیکھ لی تیری بہار

آب شمشیر دو دم کی آن تجھ میں آ گئی
کس نگاہِ مست کی یہ شان تجھ میں آ گئی

کس لبِ شیریں کے یہ انداز تجھ کو بھا گئے | بانس کی پوری میں یہ اعجاز کیسے آ گئے
بےخودی کے گھر کے بادل ہر طرف کیا چھا گئے | تیرے نغمے تھے خدنگِ ناز دل تڑپا گئے

چلتے چلتے سُن تیری دُھن ایک خلقت جم گئی
پانی بہنے سے رکا چلنی ہوا بھی تھم گئی

اک فقط انساں نہیں تیرے نشے میں چور ہیں | جانور تک مست ہو کر آشیاں سے دور ہیں
ہیں نہی عالم کے سینے دل جگر کافور ہیں | ایسے کیا تجھ میں ہی پنہاں راز حق کے نور ہیں

منزلِ عرفاں کی کیا تجھ میں ہی راہیں بند ہیں
تجھ میں ہی کیا معرفت کی خوبیاں وہ چند ہیں

رنگ گو تجھ میں نہیں لیکن وہ بو معقول ہے | ہے کلی کس باغ کی تو کس چمن کا پھول ہے
صرف ہے اس نحو سے اوقات جو مقبول ہے | تیری رنگینی نہ سمجھے جو کوئی مجہول ہے

دُور ہے امکانِ انسانی کی یہ تمیز سے
باغباں نے کیا خبر سینچا تجھے کس چیز سے

ایسی تو قسمت کہاں سے مول لائی بانسری | کس ہوا میں پرورش تو نے ہے پائی بانسری
تجھ میں ایسی کون سی خوبی سمائی بانسری | شیام نے ہونٹوں پہ رکھ کر بجائی بانسری

بھاگ ہیں تیرے بڑے تیری عجب تقدیر ہے
رشک عالم کو ہوا اک خلق دامن گیر ہے

ہو گیا تجھ کو تقرب اُس کا حاصل بیگماں | جو صفاتِ نورِ حق ہے مظہرِ کون و مکاں

ذاتِ والا ہے جہاں میں معرفت کا اک نشاں
مخزنِ راز و حقیقت طاقتِ روحِ رواں

جس کے قدموں کا تصوّر روح کو اکسیر ہے
تجھ کو ہاتھ اس کے ملیں تیری بڑی تقدیر ہے

وہ لبِ نازک کہ جن میں رازِ عرفاں ہے نہاں
وہ لبِ رنگیں کہ جن کی ایک جنبش کام جاں

وہ لبِ نازک کہ گیتا ہو گئی جن سے عیاں
وہ لبِ لعلیں کہ جن کا معتقد ہے اک جہاں

اُس لبِ معجز نما تک بار تجھ کو مل گیا
واہ وا یوں غنچۂ تقدیر تیرا کھل گیا

سچ تو کہہ اے بانسری ایسی صفا کیا تجھ میں ہے
خالقِ کونین کی ایسی ضیا کیا تجھ میں ہے

بادۂ عشقِ حقیقی کا نشہ کیا تجھ میں ہے
معرفت کی رمز کا ایسا پتا کیا تجھ میں ہے

منزلت تیری رفیع الشان کیوں کر ہو گئی
اس قدر اونچی تیری ہر آن کیوں کر ہو گئی

برج بھومی میں تری آواز گونجی اس قدر
دل کے کانوں میں ہوا مشتاق تیرا سر بسر

گُن بھرے ہیں تجھ میں کس نے کوٹ کر یہ سر بسر
ہو گئے سب مست سر کی ہے نہ پاؤں کی خبر

برج سے لے کر زمانہ بھر میں تیرا شور ہے
تیری لے کا راج ہر دل میں ہے کتنا زور ہے

بحرِ عرفاں کی مگر تو گوہرِ نایاب ہے
گیان تجھ میں ہے بھرا گیتا کا تو اک باب ہے

آفتابِ معرفت ہے غیرتِ مہتاب ہے
کچھ تو ہے اسکا سبب یہ عالمِ اسباب ہے

تجھ میں یہ رنگِ حقیقت کی جھلک کیوں آ گئی
ہر طرف تیری صدا سارے دلوں پر چھا گئی

بانسری نے سن کے میرا یہ سوالِ دل گداز
بولی سنئے غور سے کہتی ہوں جو بندہ نواز

سوزِ دل کے لطف کو جو جان سے ملتا ہے ساز
کھولتی ہوں آپ کے آگے جو پوشیدہ ہے راز

اپنے آپے کو مٹایا شان عالی ہوگئی
بھر گیا ہے گیان جب ذروں سے خالی ہوگئی

بات ہے سچّی نہیں اسمیں ذرا بھی قیل و قال — اصلیّت ہے یہ خلا دنیا میں ہی بیشک محال
جب برائی چھوٹتی ہے تو بھلا ہوتا ہے حال — گر نہیں تم کو یقیں تو دیکھ لو میری مثال

حضرتِ شیدا انہیں ہے رشک میری شان پر
مر تبہ پایا ہے یہ کھیلی ہوں جب میں جان پر

# کشن گوپال شیدا وزیرآبادی

## سری کرشن چنچل[1] سے

پیاری فقط اسی نے تو رسوا کیا مجھے — غم سے اسی نے ہائے شناسا کیا مجھے
آوارۂ جہانِ تمنّا کیا مجھے — جادو کیا کہ ٹونا کیا کیا کیا مجھے

بیٹھے بٹھائے روگ یہ جاں کو لگا دیا
گوپی نہیں تو مجھکو کنہیا بنا دیا

یشمتا کی گود میں ہوں کبھی گاہ بن میں ہوں — گر راج پر کبھی کبھی آب جمن میں ہوں
صحرا میں ہوں کبھی کبھی صحنِ چمن میں ہوں — قیدی بنا ہوا کبھی بھگتو کے من میں ہوں

ہونٹوں سے ہے لگی مرے اک پوری بانس کی
جوگن ہے اور رکھتے خبر سانس سانس کی

کہہ کہہ کے تم ہی نے تو مری جاں پیا پیا — چپکے سے میرے سلو سے دل کو چرا لیا
ماکھن کھلایا آپ ہی خود ہی گلہ کیا — الٹا جہاں میں چور مجھی کو بنا دیا

[1] مدھوسودن کرشن ہردو حصہ ۱۹۱۱ء لاہور صفحہ ۲۱۱ — ۲۱۲

القصّہ اس پریم سے دل چُور ہوگیا
کرنا نہ تھا جو اُس پہ بھی مجبور ہوگیا

نرگن مرا ہی نام نرا کار میں ہی تھا … خلوت میں احدیت کی سبکبار میں ہی تھا
مرضی کا اپنی دہر میں مختار میں ہی تھا … ہر ایک کی پہنچ سے جو تھا پار میں ہی تھا

اس پریم کا بُرا ہو کہ ساکار کردیا
اہلِ براج کے موہ میں گرفتار کردیا

## ترجھری[1]

## ندی کا خطاب سمندر سے

وہ بھی کیا دن تھے میں اک ابلا تھی … بھولی بھالی تھی سراپا خوبی
میں تھی اور ماں میری بن کی دیوی … اُس پہ میں مجھ پہ وہ جان تھی دیتی

میں تھی اور وہ پرورش ساور
ماں سوا کچھ نہ زمانے کی خبر

یہ ہمالے کے جو ہیں دشت و جبل … گو دکھی اُن کی میرا عیش محل
اُن کے گمبھیر من اور میں چنچل … ایک چنچل تھا تو تھا ایک اچل

بن کے وحشی یہ طیور و اشجار
کرتے آ آ کے نہ تھے کیا کیا پیار

دوڑتی پھرتی تھی میں بن بن میں … کبھی صحرا میں کبھی گلشن میں
نہ تو بھے تھا نہ جھجک تھی من میں … پھُول رہتے تھے بھرے دامن میں

بھولی بھالی تھی میں البیلی تھی

[1] مدہیہ مسودہ ن کرشن ۔ ۱۹۴۳ سے ۱۹۵۰ تک کل ۳۴ بند ہیں جن میں سے ۱۲ انتخاب کئے ہیں۔

پریم کا کھیل یہ کب کھیلی تھی

پھول صحرا کے ہوں یا گلشن کے — زینت افزا تھے میرے جوبن کے
جی میں خوش ہوتی تھی میں بن ٹھن کے — سج کے چلتی تھی سدا تن تن کے

رخِ زیبا سے چمن شرمندہ
شوخ آنکھوں سے ہرن شرمندہ

خوشنما نورِ نظر قدرت کے — لاڈلے پالے ہوئے فطرت کے
بوسے لیتے تھے میری طلعت کے — سب ثنا خواں تھے میری طینت کے

جو تھا کرتا تھا ذرا مجھ پہ ہی جاں
کھیلتے پھرتے تھے ہم یاں کبھی واں

چال متوالی سی چلتا کوئی — چوکڑی بھرتا نکلتا کوئی
کودتا کوئی اچھلتا کوئی — ناز سے راہ میں مچلتا کوئی

کیا ہی دلکش تھیں وہ پیاری حرکات
تھی خوش آیند وہ کیا صبحِ حیات

سیدھی سادی تھی میں گمراہ نہ تھی — کسی شے کی بھی مجھے چاہ نہ تھی
نام سے پریم کے آگاہ نہ تھی — نیک و بد کی بھی تمیز آہ نہ تھی

جانتی بھی نہ تھی میں پریم ہے کیا
اس کا پھل میٹھا ہے یا کچھ کڑوا

گا کے اور ناچ کے بن کے پنچھی — دونی کر دیتے میرے دل کی خوشی
ناچتا مور تو کوئل گاتی — قمری کو کو تو پپیہا پی پی

ایسے ان تھک تھے یہ اربابِ نشاط
بند ہوتا ہی نہ تھا بابِ نشاط

سیوتی - موتیا - بیلا - چنپا | نسترن - جوہی - گل و برگِ حنا
ہر سحر پیار سے لا لا کے صبا | گھر میں دیتی تھی مرے فرش بچھا

کرتی مشاطۂ قدرت جو سنگار
بیسیوں ہوتے مرے سینے پہ ہار

شانتی سے تھا زمانہ بھرپور | ہر طرف موجزن اک بحرِ سرور
کونے کونے میں تھا آنند کا نور | ظلمتِ رنج و محن تھی کافور

لہلہاتے تھے ہر اک سمت شجر
گاؤں آباد تو خوش حال نگر

صبحدم آتیں جب اوشا رانی | دل فریبی میں عدیم الثانی
رات اور دن کی وہ کھینچا تانی | چاند کا ہونا وہ پانی پانی

کچھ عجب سیر دکھا جاتا تھا
لطف بے ساختہ آ جاتا تھا

اُن کی ساڑھی کے سنہری آنچل | ڈال دیتے تھے فلک پر ہل چل
انجلی دینے کو جاگ اُٹھتے کنول | بھینٹ میں لاتے شجر پھول اور پھل

ہار پھولوں کے پروئے جاتے
بھگت بھر بھر کے چنگیریں لاتے

لا کے رکھتے وہ جب چرنوں پر | دل پہ ہوتا تھا مرے کیا ہی اثر
گاتی میں خوب ہی کیا سُر بھر بھر کر | پڑتی ہر اک کی مجھی پر تھی نظر

تحفوں پر تحفے چلے آتے تھے
مہ جبیں مجھ سے لپٹ جاتے تھے

سیدھا سادہ میرا گانا سُن کر | صدقے ہوتی تھیں دِشائیں مجھ پر

چومتے پاؤں میرے شمس و قمر
ٹوٹا پڑتے ملک و جن و بشر

خوبرو میری بلائیں لیتے
بھگت جن مجھ کو دعائیں دیتے

سب کو خوش دیکھ کے اوشا رانی
کرتیں دل کھول کے زر افشانی
دیتیں زر جیسے سمندر پانی
سب پکار اُٹھتے ہیں دھن مہرانی

یہ سماں دیکھ کے کھل جاتیں وہ
ہو کے خوش ناچتیں اور گاتیں وہ

غازہ مل دیتیں وہ سب کے رخ پر
مانگ سیندور سے دیتیں بھر
سیر ہولی کی سی آ جاتی نظر
خوش نظر آتے ملک جن و بشر

وہ سماں جب مجھے یاد آتا ہے
دل میرا کوئی مسل جاتا ہے

وہ شب راس وہ بدر کامل کا
وہ برج گوپیوں کے پریمی دل
ناچنا گانا وہ سب کا مل مل
کبھی رونا کبھی ہنسنا کھل کھل

وہ گوردھن وہ لب آب جمن
غیرت خُلد وہ بن اور اُپ بن

سُن کے آنند تو کچھ مجھ کو ہُوا
پر تھی نادان نہ سمجھی اصلاً
لال کا ان باتوں سے ہے کیا منشا
بر کسے کہتے ہیں اور پریمی ہے کیا

سمجھی کُل دیوتا ہو گا کوئی
وقت پر پوجنے جوگا کوئی

کھیل یہ پریم کا تھا کب کھیلا
جانا ہو گا کوئی میلا ٹھیلا
خوش ہوتی دیکھیں گے ہم بھی میلا
ماں سے مل جائے گا پیسہ دھیلا

مل کے جائیں گے سب احباب وطن

کھیل اور کود میں بہلائینگے من

آگ ساون نے لگا دی تن میں | کیا کہوں کیا تھا بھرا جوبن میں
گھر تجا پھرنے لگی بن بن میں | نہ رہا موہ نہ محبت من میں

تھی جو نرجھرنی وہ بھولی بھالی

ہو گئی ترنگنی مد متوالی

راہ میں میری نہ کیا کیا آئے | خوشنما باغ سہانے قصبے
سینکڑوں ندیاں ہزاروں ٹیلے | لہلہاتے ہوئے پربت اونچے

پہ کسی پر نہ ہُوا دل مائل

تھا یہ کس تیر نگاہ کا گھائل

چکھتے ہیں پریم کا جو لوگ مزا | یہی ہو جاتی ہے کیا اُن کی دشا
جان کر دیتے ہیں کیا یوں ہی فدا | ہوش کیا سب کے نہیں رہتے بجا

کیا اسی شوق کو کہتے ہیں پریم

کیا اسی ذوق کو کہتے ہیں پریم

قعر ظلمت سے اٹھا لو مجھکو | اپنے چرنوں سے لگا لو مجھ کو
مری جاتی ہوں بچا لو مجھکو | اپنا ہم رنگ بنا لو مجھ کو

پر وہ مایا کا ہے اپنا لایعنی

بیچ پڑتی ہیں دوئی کیا معنی

تم دیالو ہو دیا ایسی کرو | کہ جدائی کبھی ممکن ہی نہ ہو
ایک ہو جائیں ملا ہاں ہم دو | فرق رہ جائے نہ کچھ بھی ہم دو

ستیا ہم ہو تم تو میرا شیدا نام

# صفدر علی صفدر مرزاپوری[۱]

## اُدھر آ تو پھول والے[۲]

یہ صدا کسی کی سُن کر کہ یہ ہار بیچ ڈالے
وہ کھڑے پکارتے ہیں "اُدھر آ تو پھول والے"

وہ زمانہ کمسنی کا وہ بناؤ سادگی کا
کہ پڑے ہیں کانوں میں بھی ابھی سادے سادے بالے

وہ ہے رنگ ارغوانی وہ اُٹھان پر جوانی
وہ شریر چتونیں ہیں کہ ہمیں ہیں جی کے لالے

وہ ادائے ادا میں مستی، وہ حیا حیا میں شوخی
وہ نظر نظر میں جادو کہ جو چاہے سو چلا لے

وہ متانت اور تمکیں وہ لب اُنکے کتنے شیریں
مہ نو میں بال آئے جو بل ابروؤں پہ ڈالے

وہ مژہ کے تیر آفت وہ نگاہیں اک قیامت
جو ادا ہے وہ نئی ہے جو چلن ہیں وہ نرالے

مجھے کر نہ دیں پریشاں کہیں بکھرے بکھرے گیسو
مرے دل کے ہوں نہ گاہک مرے دل لبھانے والے

یہی راز دار دل ہیں یہی پردہ دار دل ہیں
جنہیں چلمنوں سے دیکھا ابھی ہم نے سر لگا لے

نہ تو شوقِ دلربائی نہ تو ذوقِ خودنمائی
کشش ایسی حسن کی ہے کہ کھنچے ہیں کھینچنے والے

کوئی شیخ مبتلا ہے کوئی برہمن فدا ہے
کوئی کھینچتا ہے آہیں کوئی کر رہا ہے نالے

تری شوخیوں کے صدقے تری اس صدا کے قرباں
کہ تڑپ تڑپ گئے ہیں جسے سُن کے سننے والے

مرے دل کو ہے یہ حسرت کہ وہ مست نازِ اُلفت
پھر اُسی ادا سے کہہ دے "اُدھر آ تو پھول والے"

---

[۱] ادیب۔ الہ آباد۔ جنوری ۱۹۱۳ء صفحہ ۵۱ [۲] نیچرل شاعری۔ مرتبہ صفدر مرزاپوری۔ لکھنؤ بار اول۔ صادبو پرشاد پبلشر

# علی نقی صفی لکھنوی

## رباعیات[۱]

ہشیار ہے ساکنانِ میخانۂ عمر
ہر گام پہ ہے لغزشِ مستانۂ عمر
رعشہ نہیں اعضا میں نقاہت کے سبب
پیری میں چھلک رہا ہے پیمانۂ عمر

---

طفلی بھی ہوئی آہ جوانی بھی تمام
پیری کا بھی ہونا ہے یہی کچھ انجام
مائل سوئے خاک ہے جو قدِ پُر خم
اب ڈھونڈ رہا ہے اپنی راحت کا مقام

---

کب قد میں بوجہ ناتوانی ہے یہ خم
خمیازہ کشِ مئے جوانی ہے یہ خم
پیری میں ہے رخصت کا زمانہ جو قریب
آغوشِ وداعِ زندگانی ہے یہ خم

---

جب زور نے طعنہ ناتوانی کو دیا
پیری نے ہر الزام جوانی کو دیا
جھک کر جو کیا قدِ خمیدہ نے سلام
طاقت نے جواب زندگانی کو دیا

---

غم نقدِ حیات لوٹنے ہی کو ہے
یہ رشتۂ عمر ٹوٹنے ہی کو ہے
پیری میں کمر جھکی تو کیا دم کا قیام
اب تیر کماں سے چھوٹنے ہی کو ہے

---

ہے توسنِ عمرِ گذراں گرمِ شتاب
طفلی کا زمانہ ہے نہ ہنگامِ شباب

[۱] ادیب ۔ الہ آباد ۔ مئی سنہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۵۵

پیری کا خمِ پُشت سے ہے یہ مقصود ۔۔ غافل سمجھ اس عہد کو بھی پا برکاب

---

لَو سوئے چراغِ صبحگاہی نہ لگا ۔۔ دل جز طرف یادِ الٰہی نہ لگا
پیری کو خضاب سے تدِ رنگِ شباب ۔۔ اے شیخ سفیدی میں سیاہی نہ لگا

---

روٹھا ہے شباب اس طرح تو ہم سے ۔۔ رکھا نہ تعلق بھی سرِ مو ہم سے
یہ قدِ دوتا پہ جھریاں کب ہیں صفیؔ ۔۔ پیری بھی ہے آہ چین بہ ابرو ہم سے

---

پیری آئی وہ پیامِ رخصت ۔۔ ہے بہرِ حواس اذنِ عامِ رخصت
یہ قدِ دوتا کا ہے اشارہ غافل ۔۔ کرتی ہے تجھے زیست سلامِ رخصت

---

بڈھے سے کسی جوان نے پوچھی یہ بات ۔۔ کیا ڈھونڈھتے رہتے ہو جھکے تم دن رات
اس نے یہ کہا ارے جوانی بابا ۔۔ جو خاک میں مل گئی ہے ظالم ہیہات

---

تقدیر[1] شباب و عمرِ فانی کیا تھی ۔۔ یہ بھی نہیں یاد وہ کہانی کیا تھی
غفلت سے کھلی آنکھ تو معلوم ہُوا ۔۔ اِک نیند کا جھونکا تھا جوانی کیا تھی

---

دل میں ہوسِ درہم و دینار نہ رکھ ۔۔ خم پشت ہے عصیاں کا بہت بار نہ رکھ
پیری میں سر اس غرض سے جھکتا ہے صفیؔ ۔۔ یعنی دنیا سے اب سروکار نہ رکھ

---

[1] ادیب ۔ الہ آباد ۔ اگست ۱۹۱۲ء ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صفحہ ۹۷ ۔

# ونائک پرشاد طالب بنارسی[1]

## ٹائیں ٹائیں فش

ایک لیکچر میں جا کے ہم بیٹھے — جس میں تھے سیکڑوں شریف انفاس
لالہ، بابو، گوسائیں اور جتی — شیخ، سیّد، پٹھان، پنڈت، بیاس
میر مہدی — میاں تراب علی — لالہ ہرداس، سیٹھ رام نواس
دس منٹ بعد لیکچرار اُٹھے — لگے کرنے وہ چیخ کر بکواس
بولے اے بھائیو کرو وہ کام — جس میں ہو فائدے کی اپنے نکاس
خالی افسوس سے نہ کچھ ہوگا — کام دے گی نہ صرف حسرت و یاس
جوش میں لاؤ قومی ہمدردی — آس رکھو نہ ہو خدا سے نراس
جو نہ رکھے خیال سود و زیاں — آدمی وہ نہیں، وہ ہے نسناس
یوں رہو تم بھی مل کے شیر و شکر — جس طرح سے ہے نیشکر میں مٹھاس
اپنی کشتی بچا لو طوفاں سے — بحر عالم میں بن چلو الیاس
پھرو مطلب کو اپنے دیس بدیس — ایک کر ڈالو بمبئی مدراس
اپنی دولت بڑھاؤ اپنے آپ — ڈھونڈ لاؤ فلاح کے اجناس
توڑ لو آسمان کے تارے — ایک کر ڈالو دھرتی اور آکاس
اب نہ کاغذ کے گھوڑے دوڑاؤ — نہ رنگو بے مفاد کو قرطاس
جو کہو اس پہ کچھ عمل بھی کرو — تاکہ محنت سے کام آئے راس
کیوں جلاہوں سے کیجیے لٹھم لٹھا — پاس اپنے نہیں جو سوت کپاس

[1] مخزن، فروری ۱۹۱۳ء صفحہ ۶۰ - ۶۱ -

عزم ہے دل میں اور عدم میں عمل
گھر میں گھوڑا ہے اور مول نخاس

کہنے کرنے میں فرق ہوتا ہے
فربہی اور - اور ہے آماس

کرلو اپنی ترقی محنت سے
چین سے گاؤ پھر بہاگ و بھاس

ہو چکا ختم جس گھڑی لیکچر
جب کہ برخاست ہو گیا اجلاس

کچھ کسی کو ہُوا نہ شوقِ عمل
رہے غافل پچاس میں اُنچاس

تالیاں بج گئیں چیئرز ہوئے
شور اُٹھا ہیئر ہیئر بندھی آس

سُنکے اس کان اڑا دیا اُس کان
ایک کو بھی نہ کچھ ہُوا احساس

جب کہ کُل روم ہو گیا خالی
چل دیئے ہم بھی کرکے آہ والاس

# محمد ہادی عزیز لکھنوی

## ابرِ نو بہار[1]

بپاسِ خاطرِ رندانِ بادہ خوار برس
برس برس کے دن اے ابرِ نو بہار برس

دعائیں مانگی ہیں ساقی نے کھول کر زلفیں
بسانِ دستِ کرم ابرِ جبلہ بار برس

جبال و دشت و گلستاں میں بھر دے آب جل تھل
نکال خوب سا دل میں جو ہے بخار برس

کوئی تو تربتِ عاشق پہ رونے والا ہو
ذرا چمن میں برس کر سرِ مزار برس

مقابلے پہ اگر تیری پست ہے ہمت
تھمی ہوئی ہے مری چشمِ اشکبار برس

دلوں میں کچھ تو جمادات کے پڑی ٹھنڈک
نکل رہے ہیں ہر اک سنگ سے شرار برس

گلوں سے بھر گئیں ہیں جھولیاں زمیں کی سب
نمو کا جوش ہے ہاں تو بھی بار بار برس

[1] ادیب۔ الہ آباد۔ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء صفحہ ۴۲

شبابِ حُسن کی گرمی بڑھی ہوئی ہے بہت
دلوں کو شعلہ مزاجوں کے ہو قرار برس

صدف ہے قلزمِ موّاج ہیں کشادہ دہن
گہر فشاں ہو اب اے ابرِ قطرہ بار برس

پرانے داغ جو تھے دل میں پھر سے ہوں تازے
سرزمینِ گلستانِ لالہ زار برس

بڑھائے جوششِ دل سبزی پہاڑوں کی
رواں ہو چادرِ بارانِ آبشار برس

ترے کرم سے ہے بارانِ لطفِ ساقی بھی
قریبِ مسکنِ رندانِ مے گسار برس

نظر فریب بنا چوٹیاں پہاڑوں کی
لبوں سے وسعتِ دامانِ کوہسار برس

تجھے بھی جوش ہے آوازِ رعد کہتی ہے
بھرا ہوا ہے مرے سر میں بھی خمار برس

عزیز رشحۂ افکارِ نو سے ہے سرخوش
اگر ہو جوش تو لے ابرِ نو بہار برس

---

## فوّارہ[1]

مرے فوّارے عجب دلچسپ ہے تیرا سماں
یہ تیری طبعِ رواں اور یہ ترا جوشِ نہاں

رات دن سانچے میں وہ موتی پہ موتی ڈھالنا
ہو نثارِ باغِ رضواں پر وہ ڈورے ڈالنا

گوہر افشانی تری اور ہلکی ہلکی وہ پھوار
وہ شبابِ اہلِ گلشن اور وہ تیرا نکھار

وہ اکڑ کر دیکھنا اپنی جوانی کی بہار
وہ ترا انگڑائیاں لینا چمن میں بار بار

مضطرب موجِ ہوا پر تو بہت بیتاب ہے
تیری دھاریں جھومتی ہیں یا کہ نخلِ آب ہے

تو چمن کی روح ہے اور ہے فضا میں تیرا دور
اک بہارِ شادمانی ہے ہوا میں تیرا دور

طائر آتے ہیں ترے دامن میں پر کھولے ہوئے
عاشقِ شوریدہ سر بیٹھے ہیں سر کھولے ہوئے

تیرے دستِ گوہر افشاں کی یہ حالت دیکھ کر
جھولیاں گلشن نے پھیلا دیں سخاوت دیکھ کر

---

[1] زمانہ۔ کانپور۔ جولائی ۱۹۱۰ء صفحہ ۵۸

گوندھا موجِ ہوا پر موتیوں کے ہار کا — تیرے سر سہرا رہا ہے رونقِ گلزار کا
ٹپکے آنسو دیدۂ بلبل میں تو پنہاں ہوا — عارضِ گل پر سے قطروں سے عرق افشاں ہوا
مندمل کر دے تجھے ایسا کوئی مرہم نہیں — تیرا جو سوراخ ہے ناسورِ دل سے کم نہیں
تیز ہو ہاں میرے فوارے ذرا پھر تیز ہو — پھر جواہر خیز و گوہر بیز و گوہر ریز ہو
آتشِ گل کا جہاں کچھ بھی اشارہ ہو گیا — اُڑ گیا موجِ ہوا پر یوں کہ پارہ ہو گیا
عاشقی کا خاص اثر جب ایک حد تک بھر دیا — نالۂ بلبل نے تیرے دل کو چھلنی کر دیا
تیرا جو قطرہ گیا گردوں پہ تارا ہو گیا — جب گرا آ کر زمیں پر دل ہمارا ہو گیا

سب غبارِ خاطرِ ناشاد تجھ سے دھو گیا
تیرا منظر اک طلسمِ دل فریبی ہو گیا

# شاہ محمد عبد الصمد عرف ن مست خانصاحب

## دربیان[۱] کشتِ آخرت

دل ترا ہے کشتِ مرشد کاشتکار — جو وہ بو دے سو وہی نکلے ہوشیار
عشق ہے اس کشت کا جوتا پسر — ہل ہے اسکا فکرِ حق اے ذی بصر
بیل ہیں اس کشت کے اے نیکداں — یعنی تنہائی و بیداری جواں
ہے بجائے چاہ چشمِ اشک ریز — ہے بجائے شاہ شاہ رستخیز
ہے بجائے تخم نامِ ذو الجلال — کشت دل میں اسکو بوئے باکمال
ہیں بجائے پاسباں ظاہر عمل — گر نہ ہوں یہ کشت میں آوے خلل
جب یہ کامل تیری ہووے کشت زار — تجھ کو آ کے آپ ہی کاٹ لے دیندار

۱؎ رہبر راہِ حق با مجموعہ رسائل دیگر۔ نولکشور پریس کانپور۔ ۱۳۰۸ھ صفحہ ۲۵ - (تحفۃ العاشقین۔)

لائے میداں میں تو رکھ خرمن پسر — دے ہوا اثبات کی پھر سربسر
برق سے خرمن کو رکھنا تو بچا — برق یعنی شرک ہے اے باخدا
جب نکالے خوشہ سے دانہ عزیز — پھر نگہباں اس کا رہ اے باتمیز
کیونکہ دشمن اسکے ہیں لاکھوں جواں — بے نگہبانی نہ چھوڑیں بے گماں
بند کر غلہ کو اس جا ہوشمند — جس جگہ پہونچے نہ موشوں سے گزند
جانتا ہے وہ مکاں اے بے خبر — جس جگہ پہونچے نہ موشوں سے ضرر
یعنی وہ دل جو ہے ہر جاں اے جواں — واں نہیں موشوں کا ہرگز کچھ نشاں
موش کیا ہے جانتا ہے اے حبیب — یعنی شیطان لعین بے نصیب
یعنی شیطان ہر رگ میں تیری مثل خوں — پر نہیں دل میں گذر اے ذوفنوں
کیونکہ اس میں نور حق ہے آشکار — ہو گریزاں دیکھ شیطاں نابکار

## بھجن[۱] در سلوک طریق نقشبندیہ

ہر ہر کرے اور گُرُ کو دیکھے اُسکو ملنا پیارا ہے

نام نرنجن کا مدھ پیوے دھیان کرو مدھ دھارا ہے — پاک رسول کا عاشق ہووے وہ ہی شکل سنوارا ہے
الکھ لکھے اور سبکو میٹے اُسنے گیان سنوارا ہے — پٹ بھیتر کے چت سے کھولے پھر کیا جب منا نیارا ہے
کیل ہے اچرج دیکھو سادھو بوند میں سمندر سمایا ہے — جو کوئی اس کو پہچانے ستنا وہی گرو ہمارا ہے

[۱] (مجموعہ توحید) صفحہ ۵

## در سلوک طریق چشتیہ

کیا ہی مزا ہے دیکھو سادھو انحد باجا بجتا ہے

اس انحد میں لاکھوں باجے اسکو کوئی نہ سنتا ہے
اس انحد کو جو کوئی سن لے رغبت سے نسا دبلتا ہے

پیٹے دل میں چھپا او بھے جگمگ جگمگ کرتا ہے
اس کے اندر ہے اک مورت برلا کوئی لکھتا ہے

سب بیٹھ سنتا دل کے اندر گر سے سیکھو اسکا منتر
بنا گرو یہ گیان نہ آوے نگرا سر کو دھنتا ہے

## لال چند فلک لاہوری

میں[1] مانگتا نہیں ہوں دولت جہاں کی تجھ سے
میں چاہتا نہیں ہوں حشمت جہاں کی تجھ سے

دنیا میں میں نہیں ہوں خواہان جاہ و عزت
شہرت پہ بھی جہاں کی میں بھیجتا ہوں لعنت

کچھ اپنی مفلسی کا شکوہ نہیں ہے مجھ کو
قصہ بھی اپنے غم کا کہنا نہیں ہے مجھ کو

یہ التماس لے کر آیا ہوں تیرے در پر
میرے وطن پہ داتا تو مہر کی نظر کر

ہندوستاں کو پھر سے فخر جہاں بنا دے
اس اجڑے بوستاں کو رشک جناں بنا دے

سرسبز یہ جو ہوگا پھولوں پھلوں گا میں بھی
نشو و نما یہ پائیگا تو پلوں گا میں بھی

صفحہ ۱۸

---

کیا ہوتا اگر دل سے کوئی نالہ توڑتے بلبل
کہاں گل خار بھی آنسو بہاتے اپنی آنکھوں سے

صفحہ ۲۸

---

بوسہ دیتا نہ خوشی سے صبا کا جو چمن میں رنگ
آنکھوں سے شہیدوں کے دل میں رکھیں پھولوں کی طرح

اللہ رے خدا رو پھول کہیں خاک میں ملیں
کانٹے وطن کے جو خس و خاشاک میں ملیں

صفحہ ۳۶

[1] کلام فلک - چوتھا ایڈیشن - سنہ ۱۹۲۳ء

ہاں اے فلک بڑھے جا سب آفتیں سہے جا
جب تک کہ دم میں دم ہے درد وطن کہے جا
صفحہ ۳۷

ہم کو مٹانے والے مٹ مٹ گئے فلک خود
باقی رہا رہے گا نام و نشاں ہمارا
۳۸

مصیبت آ ترا ہم دل سے استقبال کرتے ہیں
پئے شمشیر سینے کو جگر کو ڈھال کرتے ہیں
کوئی اس طرح سے کیا پھاگ کھیلیگا لنگوٹی میں
ولایت کو تو نگر ہند کے کنگال کرتے ہیں
۴۸

سانگا کی طرح کھالوں خوش ہو کے تیغ کا پھل
ہو بازوؤں میں پیدا پرتاپ کا سا کس بل
قومی وقار پر میں مٹ جاؤں مثل جیمل
حفظ وطن کی خاطر اٹھا ہوں کہ او دل

اہل و عیال چھوٹیں سر جائے جان جائے
ماتھے پہ بزدلی کی لیکن شکن نہ آئے
ص ۴۶-۴۷

نوجوانان وطن کے گر گئے اخلاق حیف
کوئی شیدائے بتاں ہے کوئی صہبا نوش ہے
شومیٔ تقدیر سے اک رہ گئے محروم ہم
ساری دنیا ورنہ آزادی سے ہم آغوش ہے
آگیا موسم خزاں کا ہو چکی فصل بہار
ہاں بجا ہے بلبل بھارت جو تو خاموش ہے
کون سنتا ہے فلک اب تجھ سے دلوانے کی بات
گیت گاتا ہے وفاداری کا جو ذی ہوش ہے
ص ۵۰

پوچھتے کیا ہو زمینداروں کی دولت کیا ہوئی
کچھ نشہ کچھ دکھاوا کچھ مالیانہ لے گیا
بھوک سے کیونکر نہ تڑپیں ہند کے بچے فلک
کھینچ کر رالی برادر دانہ دانہ لے گیا
ص ۵۲

تھی جفا و جور کی خو اگر تو دکھاوے کو بھی نبھا بھولپن
جو کلیجہ تڑپا تو سمجھے وہ کہ جگر خوشی سے اچھل گیا

جنہیں دودھ پینے پالا پالا تھا بنے آستین کے سانپ وہ | کوئی میرے بچوں کو ڈس گیا کوئی مجھ پہ زہر اُگل گیا
صفحہ ۹۶

ہندو سے کیوں مسلماں نا آشنا رہے گا | ناخن سے ماس کیسے کیوں کر جدا رہے گا
چولی کا ساتھ دامن سے کیوں چھٹا رہیگا | کب تک دل و جگر میں جھگڑا بپا رہیگا
بھائی سے اپنے بھائی کب تک خفا رہیگا
صفحہ ۱۵

مجھے مطلوب نہیں چین کا رنگیں ساغر | میرے بھارت کا مجھے جام سفال اچھا ہے
صفحہ ۳۶

آپ جا کر کیجئے سرکار کی سروس مگر | ملک کی خاطر مجھے سب کار بہشت دیجئے
صفحہ ۳۸

# کلجگ داس عُرف اُنا وپنچ

سے

# خیانت پری

ہندو کو مسلماں کردوں یہ کام ہے میرا
اور سود کا کھانا یہی اسلام ہے میرا

اجی رشوت بہت کھایا نہ کیجئے | کسی مجرم کو پھنسوایا نہ کیجئے
رپٹ لکھوانے آئے کوئی بیوقت | تو اس پر آپ جھنجھلایا نہ کیجئے
جو چوری کی رپٹ لکھوائے کوئی | تو ہرگز اُس کو دھمکایا نہ کیجئے
غنیمت جان کر کے یا حضر کو | کچوری پوری پکوایا نہ کیجئے

ملنے کا پتہ: ............ مصنف کلجگ داس سنہ ۱۸۹۰ء مطبع قیصری لکھنؤ کے جام تک سنہ ۱۹۲۲ء

ہمیشہ مال مسروقہ کی قیمت
رپٹ کے وقت گھٹوایا نہ کیجے

دفعہ چونتیس کی ہر اک کو دھمکی
خدا را آپ دلوایا نہ کیجے

حفاظت کے بہانے مفت ہرگز
تماشا دیکھنے آیا نہ کیجے

چڑھا کر عورتوں کو ڈولیوں میں
تھیٹر میں کبھی لایا نہ کیجے

خدا را گشت کے حیلے سے ہر شب
طوائف کے یہاں آیا نہ کیجے

عدالت چھوڑ دے جب کوئی مجرم
تو پھر اس وقت شرمایا نہ کیجے

نہ چھوڑیں گے نصیحت اہل ناٹک
انہیں تہمت سے ڈروایا نہ کیجے

---

## شرارت پری

بری باتوں پہ ہے کو ذرا ندامت
ملامت ہے ملامت ہے ملامت

چلے آتے ہیں ڈھیلے گھر پہ میرے
عداوت ہے عداوت ہے عداوت

نہیں دنیا میں جس کا کوئی گاہک
لیاقت ہے لیاقت ہے لیاقت

رذیلوں کو بناتی ہے جو اشراف
خیانت ہے خیانت ہے خیانت

بڑی ہے سب سے جو دنیا میں وہ شے
دیانت ہے دیانت ہے دیانت

نہ پائیں نوکری جب پاس کر کے
قیامت ہے قیامت ہے قیامت

نہ لیں یاں ان دنوں رشوت کا بار و
حماقت ہے حماقت ہے حماقت

عجب احمق ہیں جو کہتے ہیں عمدہ
صداقت ہے صداقت ہے صداقت

نہیں ہے پاس کوڑی ٹکس کیا دیں
قباحت ہے قباحت ہے قباحت

مقابل میں ہمارے حاسدوں کو
ندامت ہے ندامت ہے ندامت

بھونکتے اہلِ پولس کو رہیں کتنے ہردم — وردی اُن کو یہ سیاہ فام مبارک ہووے
دال روٹی ہی مبارک رہے بھونکو سدا — کا بھونکو مئے الستام مبارک ہووے

---

محنتانہ تو لے لیتے ہیں پر حاضر نہیں ہوتے — وکیلوں نے عجب اندھیر کی کشتی چلائی ہے

---

آیو بسنت چھائی بہار — جانے کہاں مر گئے ہمرے بھتار
ہمرو پیا کی آنکھیں ناہیں — کا پر کریں سکھی ہم سنگار
کو و وُ کے گھرماں کوئل بولے — ہمرے گھر میں پھٹکارت سیار
بیٹھے بیٹھے جیو نہیں لاگت — آو چلو کہیں کھیلیں شکار
راجہ مچھندر کے آگے سکھی شفقت — رُت بسنت میں گا دیں ملار

# برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی

## باغِ دل

دوئی کو دل سے کھو دیتی ہے وحدت ایسی ہوتی ہے — نظر آتا ہے غیر اپنا محبت ایسی ہوتی ہے
تمیزِ زلف و عارض خال و ابرو کچھ نہیں رہتی — فروغِ حسن کی تاثیر و طاقت ایسی ہوتی ہے
نظر آتا ہے نورِ روئے جاناں اسکو ہر شے میں — نگاہِ محوِ نظارہ کی حیرت ایسی ہوتی ہے
غرض کی لوث سے فکر اور فعل اُن کا مبرا ہے — جو از خود رفتہ ہیں انکی لطافت ایسی ہوتی ہے
رقابت اور غیریت کا بوجھ اس سے نہیں اُٹھتا — خیالِ حسنِ جاناں کی نزاکت ایسی ہوتی ہے
نظر معشوق آتا ہے جو آنکھ اپنے پہ پڑتی ہے — کمالِ عشق میں عاشق کی صورت ایسی ہوتی ہے

---

سلہ ادیب الہ آباد۔ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء صفحہ ۴۳۔۴۴۔

اُسے تارِ نفس تارِ گریباں کے برابر ہے ... جنونِ عشق میں عاشق کی وحشت ایسی ہوتی ہے
ہجوم کثرتِ عالم میں رہ کر ہیں الگ اس سے ... یہ ہوتے ہیں موحد اور وحدت ایسی ہوتی ہے
خبر رکھتے ہیں کل کی آپ سے وہ بے خبر ہو کر ... مئے عرفاں کے سرمستوں کی غفلت ایسی ہوتی ہے
پئے اک جام جو اسکا وہی اس کا مزا جانے ... بتاؤں کیا تجھے اس مَے کی لذت ایسی ہوتی ہے
خبر کیا میری تیری اپنی سدھ تک بھی نہیں رہتی ... جب انحدر اگ بجتا ہے تو حالت ایسی ہوتی ہے
نہ دل ہو طالبِ وصل اور نہ شوقِ دید آنکھو نکو ... اسی کو عشق کہتے ہیں محبت ایسی ہوتی ہے
جو جانا اور سیکھا لوحِ دل سے یک قلم دھو دے ... یہی ہے علم کامل اور حکمت ایسی ہوتی ہے
خزف ہے اسکے آگے کوہِ نورِ تاجِ سلطانی ... متاعِ دردِ دل کی قدر اور قیمت ایسی ہوتی ہے
اگر ہو جائے تارا آفتاب اس تک نہیں پہنچے ... خیالِ بے خودی کی شان رفعت ایسی ہوتی ہے
پڑا ہے یہ ترا سارا جہاں ایک اسکے کونے میں ... مکانِ دل کی پہنائی و وسعت ایسی ہوتی ہے
شمیمِ گیسوئے حورانِ عین سے ہے غنی کرتی ... نسیمِ گلستانِ دل کی نکہت ایسی ہوتی ہے

اگر اس باغِ دل کا تو کبھی محو تماشا ہو
تو علمِ ذات حاصل کر کے خود اپنے پہ شیدا ہو

---

# غزل [1]

تری حالت سے آنسو ڈبڈبائیں چشمِ سوزن میں ... اگر دل میں کبھی ہوں وہ چاک جو ڈالے ہیں دامن میں
جو ہوگا عشقِ صادق جذبہ کامل جلوہ گر ہوگا ... ضرورت کیا نکل کر گھر سے جائیں دشت ایمن میں
نہ کیوں پہنچے نوا بلبل کی گوشِ نازکِ گل تک ... سراپا ہو گداز دل بھر اگر اس کے شیون میں
سمایا ہو جو دل میں یار پھر تشبیہ مکانی کیا ... منزہ ہر حد و اندازہ میں جا پر اچھی با جہاں میں

[1] ادیب - الہ آباد - اکتوبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۲۰۱

ادھر آؤ سناؤں تم کو حسن و عشق کا قصہ
سجاؤ باغ میں رکھا ہے کیا نسرین و سوسن میں

گلستاں میں جو گل ہے اسکو سنکر چاک داماں ہے
بھری ہے غنچے کی دلبستگی بلبل کے شیون میں

ہے خالق عشق کی یکتائی حسنِ جہان آرا
ہے بیڑی سرو کی جو طوق ہے قمری کی گردن میں

نہیں تمییز بزمِ عشق میں صدر اور پائیں کی
ذرا دیکھو تو سبزہ کس طرح رہتا ہے گلشن میں

محبت نے نہ جسکے دلمیں چھوڑی ہو جگہ باقی
نہیں وہ فرق کر سکتا ذرا بھی دوست دشمن میں

سکونِ قلب حاصل خاک ہو دنیا کے لوگوں کو
تلون ہے بڑھاپے میں وہی جو تھا لڑکپن میں

نہ اس میں دل کے ٹکڑے ہیں نہ ہیں لخت جگر اسمیں
یہ ایسے آساں طلب تیرا کوئی دامن ہے دامن میں

ہوں مشکل در در روئے پھوٹکر کیا پاؤں کے چھالے
جو ٹوٹا کوئی کانٹا زیر پا صحرا کے دامن میں

اگر پابند ہو آدابِ رسم و شرع و ملت کے
تعلق بھائیوں میں ہو وہ جو تھا رام لچھمن میں

لگی باغِ جہاں میں آگ کیا جنسِ محبت کو
جلے گل شاخ پر بلبل مرے ہو نشیمن میں

گلے کا بن گیا ہے ہار یہ تارِ نفس میرا
الٰہی اک ذرا سا دم اس آہِ شعلہ افگن میں

نہ تھی منظور شاید ابتری تدبیرِ عالم کی
اثر پلٹے نہیں ہیں ہم ابھی سے برقِ خرمن میں

تماشے ہیں حرم اور دیر کے دیکھے ہوئے سارے
کرینگے جا کے کیا ہم مجلسِ دیر و برہمن میں

یہی طرزِ غزل خوانی رہی کیفی اگر تیری تو
عجب کیا شعر لیجائیں ترے دلّی سے لندن میں

# محمد حسین ماہ عظیم آبادی

## بہارِ کوہ[1]

گرمی کی صبح کوہ کی دلچسپ سیر ہی
وہ دُور تک بچھا ہُوا فرشِ زمردی
دلچسپ ہیں نشیب فراز اس کے جا بجا
دلکش گھنے بوٹوں کی وہ دور تک قطار
خود رو درخت اور وہ پرندوں کے چہچہے
کرتے ہیں اپنی اپنی زبانوں پہ حمدِ حق
اشجارِ نونہال خوشی میں بہار کی
رہ رہ کے بار بار وہ کوئل کا کوکنا
آتی ہے جب نسیم نظارہ کناں کبھی
آئے نہ گرد دامنِ گل پہ یہ ہے خیال
چلتے ہیں سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے
شاخیں بھی جھومتی ہیں اکڑتا ہے سرو بھی
شبنم نہیں گلوں پہ غلط ہے میرا خیال
وہ سُرخ و زرد رنگ ہیں وہ کاسنی پھول
شبنم نے بال بال جو موتی پروئے ہیں
دیکھو دل کھنچتا ہے سب ایک ہیں ایک

جس سمت جم گئی تو پلٹتی نہیں نظر
گلخواب کی بھی آنکھوں میں خم آپ کو دیکھ کر
چکنی ہیں وہ چٹانیں کہ تھمتی نہیں نظر
وہ سُرخ و زرد پھول کہ دل خوش ہو دیکھ کر
وہ سبز سبز ڈالیوں پہ سُرخ جانور
آوازیں وہ سُریلی جو دل میں کریں اثر
پتوں میں کچھ چھپے ہیں گرے کچھ ہیں ٹوٹ کر
وہ پی کہاں کا شور کہ دل میں چوکسے گھر
کیا جھومتا ہے۔ صورتِ مستانہ ہر شجر
چلتی بھی ہے نسیم سحر دیکھ بھال کر
لیتا ہے لاکھ کروٹیں سبزہ دمِ سحر
سب مست ہیں کسی کی کسی کو نہیں خبر
گلرنگی حسن سے ہیں پسینے میں تر بتر
تتلی نثار ہوتی ہے ہر گل کو سونگھ کر
کھولے ہے زلفیں شوق میں سنبل بھی تاکمر
بیخود کیا ہے بہارِ قدرت کی جلوہ گر

---

[1] [illegible] ۱۰ جون ۱۹۱۲ء صفحہ ۳۱۷

ہیں اپنی چارہ جوئی میں مرغانِ خوشنوا — کچھ گرد و پیش بیٹھے ہیں پھولوں کے جانور
چٹ چٹ صدا جو کلیوں کے کھلنے کی آتی ہے — حیرت سے دیکھتے ہیں ادھر اور کبھی ادھر
پتا کوئی کھڑک جو گیا دل دھڑک گیا — آہٹ ہوئی تو اڑ گئے غول اپنا باندھ کر
دونا ہے کیا بہار سے منظر بھی کوہ کا — اونچی چٹانوں پر وہ شعاعیں ہیں جلوہ گر
اک سو رواں ہے کوہ کی چوٹی سے آبشار — پڑتا وہ آفتاب کی کرنوں کا آن کر
شادی رچی ہوئی ہے عروسِ بہار کی — سہرا بندھا ہے نرگسِ کا جبیں جبال پہ

## رنگ و بُو[1]

کبھی یہ پھول بنے گلعذاروں کا زیور — کبھی یہ تختۂ تابوت پر ہیں جلوہ گر
کسی کے پھولوں میں کام آئے بنکے داغِ جگر — کسی غریب کی تربت پہ گر بنے چادر
مشامِ جاں ہے معطر کبھی تو نکہت سے — تو گاہ ہوتا ہے دور ان گلوں سے دردِ سر
کبھی بنے سرِ نوشاہ پر گلِ عشرت — بر آئی ان سے کبھی خواہشِ دلِ مادر
کبھی حسینوں کے بنتے ہیں بیگلے کا ہار — کبھی ہیں پہلوؤں میں سیج پر بنا بستر
کبھی ہے باغ میں اور گہ چمن پہ ان سے بہار — کبھی سہرے پہ ہیں سہرے کا گہ بنتے بستر
کبھی یہ ڈالیوں میں خوشنما دکھائی دیئے — کبھی یہ دھوپ سے گر کر پڑے ہیں مرجھا کر
کبھی تو شوق سے گلچیں لئے ہے دامن میں — کبھی زمین پہ کھاتے ہیں ہر طرف ٹھوکر
کسی نے شوق میں کپڑے بسائے ہیں ان سے — کسی نے ان کا عرق کھینچا جوش دے دیکر
کبھی ہیں بلبلیں ان پر نثار اور قمری — کبھی نثار یہ ہوتے ہیں خود حسینوں پر
کبھی تو کرتا ہے ہر وقت باغبان محنت — کبھی ہے بلبلِ نالاں خود ان پہ چشمِ تر
کبھی ہیں ڈالیاں مست ان سے صورتِ نشان — کبھی یہ پھول رسن سے بندھے ہوئے ہیں مگر
ہولے گا باغ جہاں یک بیک ہی گل ہو گئی — جو گل کھلے نہ تھے گلچیں کو ہو گئے دوبھر

---

[1] سلہ ادیب الہ آباد مئی سنہ ۱۱ء صفحہ ۲۴۶

یہی دو رنگیٔ بلبل و بہار دُنیا ہے
کہ ایک حال سے ہوتی نہیں کسی کی بسر

صدائے خندۂ ہر گُل یہ صاف آتی ہے
ہمیں تھا خوب جو پھولوں سے بنتے ہم بہتر

غرضیکہ باغِ جہاں میں ہر ایک شاکی ہے
ہوا ہمیں غنچہ کہ گُل ہو ثمر ہو یا کہ شجر

یہ جانتے کہ جو چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گُل کبھی نہ تمنائے رنگ و بُو کرتے

# تلوک چند محروم عیسے خیلی

## مہاتما بدھ[1]

## ایوانِ شاہی میں آخری رات

اے زمینِ خاک بر سر یوں نہ ہو اندوہگیں
میں شریکِ غم ہوں تیرا، تیری خاطر ہوں حزیں

تیری خاطر اور ترے بچوں کی خاطر اے زمیں
مضطرب ہوں میں مرے دل کو قرار اصلا نہیں

نیم بسمل میں بھی ہوں تو ہے اگر نخچیرِ غم
لے لیا اپنے جگر پہ میں نے تیرا تیرِ غم

ماتمی صورت ہے تیری اے سیہ پوش آسماں
تو گھٹا ہے اشکِ غم کی یا ہے آہوں کا دھواں

اشکِ خوں دامن پہ ہیں یا ہیں شفق کی سرخیاں
داغ تاباں ہیں مہ و خورشید سینے میں عیاں

تو ہے محزون اہلِ عالم کے مصائب دیکھ کر
شامِ غم صبحِ قیامت ہیں مرے شام و سحر

اے ستارو تم سراپا ہو کے چشمِ انتظار
دیکھتے ہو میری جانب صورتِ امیدوار

لو اب آیا میں اب آیا تم پہ ہونے کو نثار
کب سے ہوں آوارگی کی آرزو میں بے قرار

[1] [illegible] ادبی دنیا لاہور دسمبر ۱۹۳۷ء [illegible]

آہ میں جکڑا ہوا سونے کی زنجیروں میں ہوں
ہر گھڑی آزاد ہو جانے کی تدبیروں میں ہوں

عشرت ایام آغاز جوانی الوداع
الوداع اے ذوق و شوق عیش فانی الوداع
الوداع اے تاج و تخت مرزبانی الوداع
الفراق اے خرمی اے شادمانی الوداع
الوداع اے حسرت بسمل و نہار آرزو
اے دل غم دیدہ اب بن جا مزار آرزو

آہ پھر تیری جدائی آہ او آرام جان
اُف مچلتا ہے تڑپتا ہے دل ناشادمان
تجھ کو سوتا چھوڑ جاؤں سنگدل اتنا کہاں
آہ یہ تیری فرقت مجھ پہ ہے کوہ گراں
عزم راسخ ہے مگر منہ تجھ سے موڑوں کس طرح
رشتۂ عہد وفا کو آہ توڑوں کس طرح

تیری فرقت اور پھر اس گوہر شہوار کی
جو کہ آرامیدہ داماں صدف میں ہے ابھی
جسکو نسیان محبت نے عطا کی زندگی
آب و تاب زیست بڑھ جائیگی جس سے واقعی
شمع دل افروز ہوگا۔ خانۂ جاں کے لئے
مایۂ نور بصارت چشم حیراں کے لئے

اے فریب الفت فانی نہ تو بھٹکا مجھے
آہ اے حب وطن محبت دے نہ اب دھوکا مجھے
دیدنی ہے رونق گل پھر اس سے مطلب کیا مجھے
گھر نظر آیا ریاض دہر کانٹوں کا مجھے
یہ کشاکش ہائے بے جا ہیں سلاسل کی طرح
توڑ دوں ان کو طلسم نقش باطل کی طرح

رخصت اے ماں باپ اے ہمصفیرو اے اہل دیار
دیکھنا میری جدائی پر نہ ہونا اشکبار
کی تمہارے ہی لئے میں نے یہ فرقت اختیار
دیکھئے کیا کیا دکھائے گردش لیل و نہار
المدد اے جستجوئے صادق راہ نجات
کون سی ظلمت میں ہے اے شمع راز کائنات

# حسرتِ عشق[1]

واحسرتا کہ میں نہ ہوا دردمندِ عشق | مجھ کو کبھی نہ قابلِ ذوقِ گزندِ عشق
پہنچا نہ آہ! میرے گلو تک کمندِ عشق | تڑپا نہ خاک و خوں میں جراحت پسندِ عشق
پہلوئے دل پہ زخم نہ کاری ہوا کوئی
خونِ جگر سے چشمہ نہ جاری ہوا کوئی

بجھتی جو آبِ تیغ سے وہ تشنگی نہ دی | دل ہی دیا فضول جو دل کی لگی نہ دی
جو انتہائے عشق ہے وہ بے خودی نہ دی | تھی جس کی آرزو مجھے وہ زندگی نہ دی
سوزِ دروں سے تپشِ جاں فزا ملے
تب جا کے زندگی کا مجھے کچھ مزا ملے

ساغر سے کیوں مرے مئے جوشاں کو عار ہے | ہم مشربوں سے میری نظر شرمسار ہے
ساقی تری نگاہِ کرم پہ مدار ہے | مایوس دل نہیں ابھی امیدوار ہے
قسمت میں خم نہیں ہے تو اک جام ہی سہی
وہ ہی مثل ہے پھول نہیں پنکھڑی سہی

دیتا اگر نصیب مجھے عندلیب کا | ہرگز میں شکوہ سنج نہ ہوتا نصیب کا
دیتا وہ درد مجھ کو جو ذوق حبیب کا | محتاج میرا درد نہ ہوتا طبیب کا
آزاد ہو کے کشمکشِ روزگار سے
ہوتا ترانہ ریز کسی شاخسار سے

ہوتی مرے نصیب میں تقدیر شمع کی | شب ہائے تار زیست میں تنویر شمع کی

---

[1] مخزن۔ لاہور۔ جنوری ۱۹۱۲ء صفحہ ۶۲ تا ۶۴

ملتی جو بزم دہر میں توقیر شمع کی
منظور جان و دل سے تھی تعذیر شمع کی
منظور مجھ کو سوز و گداز شبانہ تھا
ملتا جو شانِ عشق سے جلنا بُرا نہ تھا

یا جلتا شب کو شعلۂ جانانہ بنکے ہیں
یا گرتا شمع حسن پہ پروانہ بنکے ہیں
یا پھرتا دشت نجد میں دیوانہ بنکے ہیں
اُڑتا ہوا پہ نالۂ مستانہ بن کے میں
یا اوم اوم کہتا ہوا اک امنگ میں
گرتا پھسل کے حلقۂ گرداب گنگ میں

یارب کدھر گئے میرے بلبل دہارِ عشق
میں خام رہ گیا نہ ہوا پختہ کارِ عشق
اب کیوں نہیں ہے وہ خلش نوک خارِ عشق
باغ جہاں میں آہ! نہ کوئی بہارِ عشق
پہلو میں دل ہے دل میں وہ احساس کیوں نہیں
اس گل میں تھی جو پہلے وہ بُوباس کیوں نہیں

اے لذتِ فراق میں تجھ کو ترس گیا
ذوقِ اسیری! ہاتھ سے کنج قفس گیا
اے عشق الغیاث کہ دنیا میں پھنس گیا
گوہر اس آب و تاب کا کیچڑ میں دھس گیا
آہ اضطراب دیکھا میرا دل ٹھہر چلا
اک نیم جاں تھا ولولہ پہلو میں مر چلا

ہاں اے نسیم آہ سحر تجھ کو کیا ہوا
اے گریہ سحاب اثر تجھ کو کیا ہوا
اے آفتابِ داغ جگر تجھ کو کیا ہوا
بارانِ اشکِ دیدہ تر تجھ کو کیا ہوا
نخلِ مراد کو میرے یونہی سکھاؤ گے
کس روز کام آؤ گے گر اب نہ آؤ گے

بے رنگ عشق خاک ہے تصویر زندگی
ہے آفتابِ عشق سے تنویر زندگی
دل دادگانِ عشق ہیں دلگیر زندگی
ان کی نظر میں ہیچ ہے توقیرِ زندگی

خاکسترِ وجودِ بشر میں شرر ہے عشق
انساں کو زندہ جانئیے ہمدم اگر ہے عشق

میں رہنمائے عقل سے منہ اپنا موڑ کر
وحشت سے راہ و رسمِ رفاقت کو جوڑ کر

دربانِ نام و ننگ کی گردن مروڑ کر
نکلوں گا ایک دن درِ زنداں کو توڑ کر

پابستۂ سلاسلِ اندیشہ تا کجا
سرزیرِ پائے وہم جفا پیشہ تا کجا

# دینا ناتھ مدن معجز دہلوی

## در بیان کیفیۂ وصال

میں عیاں کرتا ہوں اے جان اب وہ کیفِ وصلِ ذات
جس کو حاصل کر کے تو کُلفت سے پائے گا نجات

علم کی دُنیا میں افضل پاک و برتر ہے یہ راز
راست او ر عین الیقیں سہل اور فنا سے بے ثبات

مجھ سے ناواقف ہیں جو انسان وہ مجبور ہیں
واپسی پہ مزرعۂ اعمال کو مجبور ہیں

میں ہوں مخفی طور پر دائم محیطِ کائنات
مجھ سے کل اجسام قائم ہیں نہ ان سے میری ذات

دیکھ میری قدرتِ کامل کہ گو موجود ہے
بود عالم میری ہستی میں مگر نابود ہے

گرچہ میری وجہ سے ہے سارے عالم کا نظام
میں ہوں بے نام و نشاں عالم نہیں میرا مقام

تند چوبائی ہوا جیسے خلا میں ہے مدام
مجھ میں موجودات کا ہے ایسی صورت سے قیام

میری قدرت سے ہے رنگِ عالمِ غیب و شہود
گاہ پیدا گاہ پنہاں گاہ بود و گہ نبود

قادرِ مطلق ہوں اور میں اپنی قدرت سے ضرور
بار بار اس عالمِ فانی کو دیتا ہوں ظہور

میں سدا ہوں اپنی قدرت سے بری اور بے اثر
اس لئے پابندیٔ افعال سے ہوں بے خطر

ا؎ مخزنِ اسرار طبع دوم ۔ مرتبہ دینا ناتھ مدن معجز دہلوی ۔ رام نرائن پبلشر متھرا صفحہ ۳ تا ۴ ۔ لاہور شرح بھگوت گیتا موسوم بہ فلسفۂ الوہیت پانچواں ایڈیشن ۱۹۲۲ء مترجم و شارح مولف رائے بہادر پنڈت دینا ناتھ صاحب مدن معجز صفحہ ۱۹۵

میری قدرت کے لوازم ہیں یہ حرکت اور قرار
صاحبِ عالم ہوں میں گو جسمِ انساں میں مقیم
جنکی جھوٹی خواہشیں ہیں جنکے لاحاصل ہیں فعل
وہ میری اعلیٰ حقیقت سے ہیں بالکل بےخبر
طالبانِ باصفا جنکی ہیں ملکوتی صفات
ہے میری حمد و ثنا و بندگی اُن کا شعار
عارفوں کو جن کی وحدت پر نگہ قایم ہوئی
عالمِ اسباب میں ہوں میں ہی از سرتا بپا
میں ہی کرتا میں ہی یگ ہوں میں ہی غلہ میں ہی گھی
میں ہوں سب کا والد و مادر بزرگ پاسباں
مصدرِ عالم مقدس اسمِ اعظم اونکار
میں ہی ہوں ملجا و ماوا اور مربی خلق کا
میں تپش ہوں میں ہی بارش جاذبہ اور رادعہ
وید کے جو معتقد کرتے ہیں پیکر سوم رس
اُن کا فردوسِ بریں میں جا کے ہوتا ہے قیام
ختم ہو جاتا ہے جب ایسے ریاضوں کا ثمر
پیروانِ وید جن کا دل ہے پُر از مدعا
یاد کرتے ہیں مجھے جو لوگ با صدق و صفا
جو ارادت مند دل سے ہیں طلبگارِ صفات
میں ہوں معبود اور مجھے تنہا سمجھنے کا حصول
[illegible]

اس طرح گردش میں ہے یہ عالمِ ناپایدار
جو بشر ناداں ہیں اور اخلاق جنکے ہیں ذمیم
علم بے معنی ہے جنکا اور عقیدت جن کی جہل
زندگی حرکاتِ شیطانی میں کرتے ہیں بسر
اُن کی نظروں میں ہے کل عالم کا مبدا میری ذات
اور وہ میری یاد میں رہتے ہیں دایم ہوشیار
جلوۂ یکرنگ رنگا رنگیٔ عالم ہوئی
ہیچ ہے چشمِ بصیرت کی نظر میں ماسوا
میں ہی آگ اور میں ہی منتر اور میں ہی آہوتی
میں ہوں تینوں وید رگ سام و یجر کا راز داں
منزلِ مقصود مالک شاہد و پروردگار
تخمِ لافانی کی صورت موجبِ خلق و فنا
زندگی اور موت میں ہی حق و فکر باطلہ
پاک نیت سے ریاضت اور جنت کی ہوس
اور وہ ہوتے ہیں بہشتی لذتوں سے شادکام
واصلانِ عیش کا جنت سے ہوتا ہے سفر
جبرِ قدرت سے ہیں یوں آواگون میں مبتلا
اُن کی امداد و حفاظت فرضِ اول ہے مرا
وہ بھی میری بندگی کرتے ہیں گو بے علمِ ذات
ہیں سدا گردش میں وہ جنکا نہیں کوئی حصول
ماسوا کا ماسوا کو اور مرا طالب مجھے

پیش کرتا ہے مجھے جو تیرہ، پھل پھل یا کہ پھول ۔ یہ ہے راسخ یہ اس کا مجھ کو دل سے ہے قبول

مجھ سے کر منسوب ارجن فاعلیت فعل کی ۔ دھرم یگ تپ دان اور بھوجن ہیں اصل زندگی

جبکہ تو پابندئ افعال سے ہو کر رہا ۔ ترک کر دیگا جزائے فعل کا بیم و رجا

لوحِ خاطر سے ترے نقشِ خودی مٹ جائیگا ۔ مجھ میں واصل ہو کے تو ہستی کو میری پائیگا

سب میں میں یکساں ہوں یعنی شوق و نفرت سے بری ۔ اُس میں میں ہوں مجھ میں وہ جسکو محبت ہے میری

جان کو قربان کرتا ہے جو میرے نام پر ۔ نیک ہے بدکار بھی ملتا ہے نیت کا ثمر

نیک اعمالی میں اُس کو جلد آتا ہے قرار ۔ یہ سمجھ لے میرا طالب ہے فنا سے رستگار

فرقۂ نسواں و ناقص عقل و ویش و شودر جب ۔ سایۂ رحمت میں اعلیٰ منزلت پاتے ہیں سب

نیک خصلت برہمن اور با صداقت چھتری ۔ کیا تعجب ہے اگر ہوں رازدار سرمدی

بے ثبات عالم ہے اور مفقود ہے عیشِ دوام ۔ اتنے نکتہ کو سمجھ کر یاد کر میری مدام

مجھ میں اپنا دل لگا اور مجھ کو سچا مان لے ۔ میری خاطر کر ریاضت مجھ کو مالک جان لے

نقدِ ہستی کر مجھے تفویض تو ہو جانفشاں
مجھ میں واصل ہوگا میرے قول پر ایمان لا

# سورج نراین مہر دہلوی

## زنِ کامل

مانا کہ بحر و کان میں ہیں لعل و دُرِ خوش آب ۔ مانا بہت جواہر و زر میں ہے آب و تاب

لیکن کچھ ایسی حُسنِ خداداد چیز ہے ۔ زیور سے جسکی خوبیٔ بے مثل ہو خراب

عورت کا زیب حُسن ہے [illegible] زیور حیا ۔ [illegible] اس کا سر پہ کہ ہے زینتِ شباب

[illegible] کی صورتیں ۔ گر آنکھ میں حیا ہے تو [illegible]

لب اور دہن پہ تیرے نہ لٹکے زر اور دُرّ
دہقانیوں کی طرح کہ ہے جان کو عذاب
زیورِ دہن کا یہ ہے کہ موتی جھڑا کریں
چھوٹے بڑے ہوں وقتِ سخن اِن سے فیضیاب

---

تیرے گلے میں عفت و عصمت کے ہار ہوں
ایسے کہ تو لکھے بھی نہیں رشک سے کباب
سینہ تیرا سفینۂ الفت بنا رہے
اس میں نہ بغض و کیں کی ہو آتش کو التہاب
ایسی صفائے قلب کی ہو بلکہ روشنی
کر لیں ضیا ثوابت و سیّار اِکتساب
سینے میں تیرے دھرم ہو شردھا ہو اور گیان
دل میں تیرے ہوں علم کے انوار لاجواب

---

جوشن اگر ہوں خدمتِ شوہر کے زیبِ تن
بازو میں ان سے اور بھی طاقت ہو اور تاب
اطفال خرد سال و پیرانِ پختہ سال
محتاج ہیں مدد کے نہ کر ان سے اجتناب
چل پھر کے کر تو بے کس و محتاج کی مدد
ہارے تھکے کے بیٹھ کے تو ہاتھ پاؤں داب
عورت کی ذات خیرِ مجسم ہے دہر میں
اس کے ادائے حق میں ہؤا کون کامیاب
مظہر ہے فیضِ حق کا وہ گھر یہ جہاں سے ہے
جس جا ہے یہ خدا کا ہے احسان بے حساب
عورت پھر اس پہ وہ کہ ہم اس کی ذات میں
صورت کی خوبیاں بھی ہوں سیرت کے ہم رکاب

اُس کو بنا کے صانعِ مُطلق کو ناز ہے
اور کیوں نہ ہو کہ صنع ہے بے مثل و لاجواب

---

## مردِ کامل

تیرے بازو کی درازی کا ہے یہ کام کہ وہ
دستگیری کرے مسکیں کی جو ہو بے طاقت
ظلم ہاتھوں سے ہر اک ظالم و جبار کا روکے
دفع کر جبرِ ستمگار بہ قدرِ وسعت
کام ہے یہ تیری ٹانگوں کا کہ تو چل پھر کر
اہلِ حاجت کی مدد میں کرے صرفِ ہمّت

روح کا جسم سے اس وقت ہے رشتہ اچھا
جبکہ دونوں میں ہو یکسانی رموز و نسبت

# میں کیا ہوں

میرا ہی حسن ہوا منعکس حسینوں میں
میں مہر مشرقِ خوبی ہوں ماہ پارہ ہوں

بھرا ہوا ہے رگ و پے میں میرے نغمۂ دوست
ہمیشہ بجتا ہی رہتا ہوں وہ دوتارہ ہوں

غذائے روح ہوں میں اور لطفِ موسیقی
ستار و بین و دف و چنگ اور چکارا ہوں

---

مجھی سے نثر ہے ناشر کی نظم ناظم کی
سخن میں لطف ہوں تشبیہ و استعارہ ہوں
(صفحہ ۱۹)

---

وہ چال چل کہ عمر خوشی سے کٹے تیری
وہ کام کر کہ یاد تجھے سب کیا کریں

گر تیرا ذکر ہو تو ہو وہ ذکر خیر مہر
گر تیرا نام لیں تو ادب سے لیا کریں

---

شکرِ نعمت کے ہیں یہ معنی اگر سوچے کوئی
دے اگر خالق تو دے بندہ بھی اسکی راہ میں

حق تجھے توفیق دے تو مستحق لوگوں کو دے
مستحق تا تو بھی ہو اللہ کی درگاہ میں
(صفحہ ۲۹)

# قطعہ متفرق

کھلا ہے ابر ابھی اور ہوائے عطر آگیں
چلی ہے باغ سے کیسے قدم بڑھائے ہوئے

پہنچی کوئی جیسے کنارِ گنگا سے
علی الصباح چلے شہر کو نہائے ہوئے

گلے میں ہار ہوں پھولوں کے اور جبین و گلو
دکن کے صندل خوشبو میں ہوں بسائے ہوئے

[illegible]

دماغ ان سے معطر ہو راہ گیروں کا — جو اتفاق سے ہوں رہگذر میں آئے ہوئے

ولے خیال خود اسکو ہو یہ کسی سے نہیں

چھو نہ جائیں چلے آپ کو بچائے ہوئے (صفحہ ۲۷۹)

---

## انتخابِ غزلیات

ہم فدا ہیں دل کے اطمینان پر — بوالہوس جذبات کے طوفان پر [سلہ]

---

بہانہ خلوت کا کر کے زاہد چلا سوئے دشت تنگ ہو کر

اڑا لڑائی سے کیوں نہ بزدل مری طرح گرم جنگ ہو کر

بلند طبعوں کی ہوں ہوائیں تعلقوں کی رسن سے رہا ہیں

مگر کسی دن اڑا دوں گا میں بھی فلک کی جانب پتنگ ہو کر

صفا کرلے دل ذرا تو پیدا آئینہ میں انوار ہوں ہویدا

صفا سے پاتا ہے قدر و قیمت جہاں میں الماس سنگ ہو کر

طلسم حیرت یہ خاکداں ہے ہر ایک شے میں حق نہاں ہے

جدھر گئی عقل نکتہ داں ہے پھری ادھر سے ہی دنگ ہو کر

خدا کا جلوہ تجھے ہو کیونکر ہے جب اس طرح دل مکدر

اس آئینہ کو غضب خدا کا خودی نے کھایا ہے زنگ ہو کر

عبث ہے گریہ عبث ہے زاری نہیں ہے امکان رستگاری

طلسم امکاں نے پا بہ زنجیر رکھا ہے ہم کو قید فرنگ ہو کر

---

سلہ غزلیات مہر - دہلی سنہ ۱۹۱۴ء - بار اول

جدھر گیا ہوں جھلک ہے تیری چمک ہے تیری دمک ہے تیری
غضب ہی پردہ نشین ہے بت تو اس طرح شوخ و شنگ ہو کر
دکھا رخ اپنا مجھے خدارا کروں نظر بھر کے میں نظارا
کبھی تو میرے بھی دل سے نکلے ہر ایک حسرت امنگ ہو کر
مزا ہے یہ پھر سخن تو کا کہ دلنشیں ہو ہر ایک نکتہ
ہوں ایسے چھپتے ہوئے مضامین کہ چھید دیں دل خدنگ ہو کر
صفحہ ۵۵ - ۵۶

---

کس طرح راہِ حقیقت کا نشان ہم کو ملے
دھوکہ دینے کے لئے شیخ و برہمن ہیں بہت
(صفحہ ۳۴)

---

میری نظر میں رکھتی ہے ہر چیز حسنِ خاص
شیدا ہوں یک بہ ذاتِ حسین و جمیل کا
(صفحہ ۲۶)

---

گزارہ بھیک مانگے سے نہیں چلتا دعا مت کر
پرستش اس کی کیا کرنی جسے آنکھوں نہیں دیکھا
خدا وہ کب ہے جو محتاج ہو پیرو پیمبر کا

دل پُر مدعا سے ہے دل بے مدعا اچھا
جو دل میں بے بلائے آئے خود وہ ہے خدا اچھا
پرستار اس کے ہیں کفار ان سے دہریہ اچھا
(صفحہ ۴۴)

---

شیخ دنیا کو غلط دارِ محن کہتا ہے
آدمی کے رگ و ریشہ میں بھرے ہیں نغمے
دل اگر تیرا مسکن ہے تو گلشن ہے یہی
کیوں نہ ہمدردیٔ انساں کا بھرے دم انساں
درد گر آئے تو ہم دل میں جگہ دیں اس کو
ذاتِ انساں کی پرستش کا ہے تم کو خیال

متصل اس کو نہیں فردوس کا گلشن ہے یہی
سننے والو شور عرفان کا ارگن ہے یہی
اور مسکن نہیں مضطر ہے تو گلخن ہے یہی
دل انساں نہیں عشق کا مسکن ہے یہی
کیونکہ تہذیب کی تحریک کا مخزن ہے یہی
سمجھا صحیح ہے خدا کا رخ روشن ہے یہی
[illegible]

تیری الفت کا نہ ہو دائرہ ہرگز محدود
دل تو بے جان کو انسان کو حیوان کو دے
ولولہ عشق و محبت کا مرے دل میں رہے
مجھ کو تسکیں نہیں درکار ہے طوفان کو دے
بہرے سینے میں کبھی تنگ دل پائے نہ جا
جائے دل تو مجھے کونین کے میدان کو دے
(صفحہ ۱۵۰ و ۱۵۱)

---

ظہورِ عشق تھا مقصود انساں کے بنانے سے
نہ ہوتی یہ غرض تو کیوں خمیر آب و گل ہوتا
(صفحہ ۲۲)

---

نام و صورت کے برقع میں ہر ایک جا ہیں آپ
پردہ نشین ہو کے غضب خود نما ہیں آپ
(صفحہ ۳۰)

---

آدمی کا اے عزیز و نفس ہی شیطان ہے
دین و دنیا سے گئے مانی اگر اسکی اصلاح
(صفحہ ۴۴)

---

شرابِ بے خودی پی اسطرح سے تشنہ جاں ہو کر
خودی چمکے تیری نورِ خدا سے دو جہاں ہو کر
(صفحہ ۵۸)

---

گلہ نامہربانی ہائے بے پایاں کا مٹ جائے
جو دو باتیں کبھی سن لو تم ہماری مہرباں ہو کر
کہیں اسکی طرح سرگشتگی تم کو نہ ہو اک دن
ستاتے تو ہو خلق اللہ کو تم آسماں ہو کر
(صفحہ ۵۸ و ۵۹)

---

دیدۂ نظارہ بیں کو تابِ نظارہ نہیں
جلوہ دکھلا دیکھنے والے کو اے جاں دیکھ کر
ہے شراب اس جا حرام اور جا کے جنت میں حلال
مجھ کو آتی ہے ہنسی زاہد کا ایماں دیکھ کر
(صفحہ ۵۸ - ۵۹)

# نادر علی خاں نادر کاکوری

## پچھلے پہر کی کوئل

افسوس ہمصفیرو آئے ہو کیسے چمن میں
رونا پڑا یہاں تو ہے مرگِ باغباں کا

وہ بلبلوں میں نغمے اب عشق کے کہاں ہیں
قسمت کا یاں گلہ ہے یا شکوہ آسماں کا

افسردگی سے میں بھی معذور ہو رہا ہوں
کیا ساتھ دوں میں اپنے یارانِ شادماں کا

بیٹھا الگ تھلگ ہوں میں اپنا سر جھکائے
اور سوچتا ہوں تازہ انداز اک فغاں کا

مجھ سے کوئی نہ رکھو امّید نغمہ خوانی
مانا کہ میرے نغمے میں ہے مزا فغاں کا

افسوس بزمِ عالم ہے ایک بزمِ فانی
کھٹکا لگا ہے ہر دم یاں مرگِ ناگہاں کا

شہ ہو گدا ہو کوئی بھی موت سے بچا ہے
آ آ کے جان دینا ہے خوں بہا یہاں کا

یاں بیٹھی ہے اک ماں اک باپ یاں ہے روتا
یاں پیر کا ہے دسواں تیجا یہاں جواں کا

یاں دفن ہے سکندر یاں کٹ مرا ہے دارا
یہ قبر ہے فلاں کی مدفن ہے یہ فلاں کا

اِک ذرّے ذرّے میں یاں ہے خاکِ رفتگاں کی
اک چپے چپے پر یاں ہے خون بے کساں کا

شبنم اور یہ گل ہیں اشک و خونِ بلبل
گلزار یہ جہاں کا مقتل ہے کُشتگاں کا

جب آنکھ بند کر کے دنیا کو ہم نے دیکھا
لاشوں کا ڈھیر تھا اور بوسیدہ اُستخواں کا

اِس باغ اور بستان سب کو فنا ہے لیکن
یاں بولتا رہے گا طوطی سخنوراں کا ۱؎

ہاں اور کوک ابھی اے پچھلے پہر کی کوئل
گونجا کرے ابد تک نغمہ تری فغاں کا

اِک تیری ہی صدا کو دائم بقا ہے ورنہ
ہے ذرّہ ذرّہ فانی اس تیرہ خاکداں کا

سونے دے ساری دنیا گر سو رہی ہے غافل
کچھ غم نہ کر نہیں گر سنتا تری فغاں کا

۱؎ خدنگِ نظر - لکھنؤ - جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۵ و ۱۶

خاموش کوہ و صحرا سب دم بخود کھڑے ہیں　　اور مست جھومتا ہے ہر نخل بوستاں کا

وقت سحر جب اُٹھیں غفلت سے اہل دُنیا　　اور تو کرے زمیں سے جب قصد آسماں کا

اُس وقت کوک دے پھر تو اس طرح جہاں میں　　جیسے بلند نعرہ کعبے میں ہو اذاں کا

ٹکرائے قصر گردوں سے جا کے کوک تیری　　اور چھید دے کلیجہ ہر پیر اور جواں کا

سب یک زباں ہو کر مانگیں اماں کہ بس بس
تیری فغاں ہے ظالم یا تیر ہے کماں کا

---

## صبح و شام

کتنا خوش آیند ہے چاک گریبان سحر　　جس میں آتا ہے کسی نوخیز کا جوبن نظر

اُبھرے اُبھرے سینے سے جوش جوانی ہے عیاں　　وہ پہاڑوں کی نکیلی اونچی اونچی چوٹیاں

زلف کالے اور لانبے بال والا مہ لقب　　باندھتا ہے رات بھر کا صبح کو جوڑا کھلا

عاشقِ بے تابِ قدرت ہیں یہ کوے بھی کوئی　　کس قدر ہوتی ہے ان کو صبح ہونے کی خوشی

روز روشن پر پتنگے بن کے دیوانے ہیں یہ　　رات کے پروانے وہ تھے دن کے پروانے ہیں یہ

ایسے دھندلاپے میں کنجوں سے نکل کر بیقرار　　یہ نمودِ صبح کی گھر گھر کہہ آتے ہیں پکار

ایسے ایسے لوگ ہیں دربار قدرت کے نقیب　　کیوں نہ فتنے چوک اُٹھیں اور بھاگ اُٹھیں سوتے نصیب

تیرگی شب میں تھی جو رات بھر سوئی پڑی　　صبح ہوتے از سر نو پھر وہ محفل جم گئی

پھر وہی بزم تماشا اور وہی سامان عیش　　پھر وہی حیرت وہی یاس اور وہی ارمان طیش

پھر وہی افکار ہے پامال ہے ہر سمت ڈھیر　　پھر وہی جھگڑا بکھیڑا پھر وہی زحمت کھکھیڑ

گرم حسن و عشق کا پھر ہر جگہ بازار ہے　　پھر وہی ہنگامہ ہے وہی سودا وہی [illegible]

دل لئے جاتا ہے چھینے پھر [illegible] کوئی　　پھر طبیعت ڈھونڈتی ہے دروبند زیبا کوئی

پھر یہاں خلوت میں ہے دستِ ہوس گستاخ ڈھیٹ
پھر یہاں ہے میکشوں میں لات گھونسا مار پیٹ

پھر قبیلوں سے خلش پھر سینۂ پُر کینہ ہے
میکشوں میں پھر شکست توبۂ دیرینہ ہے

جا بجا دیر و حرم میں گونج اٹھی پھر ناگہاں
بانگ قرنا شورِ ناقوس اور تکبیر اذاں

ہو گئے لوگ اپنے کار و بار میں مشغول سب
مل گئے باہمد گر مردود اور مقبول سب

گاتے ہیں دریا کنارے چند بیراگی بھجن
چند ہیں دنیائے فانی کے تصور میں مگن

پاٹ دار آواز لہراتی ہوئی اٹھتی ہے اور
غرق کر دیتا ہے اسکو دفعتہً دریا کا شور

گا رہی ہیں ایک گھر میں چند کمسن لڑکیاں
بجتی ہیں ہلکے سروں میں ڈھولکیں اور تالیاں

دفعتہً ہمسایہ سے اک شورِ غم برپا ہوا
اور اُس پیاری رسیلی راگنی کو لے اڑا

بچے بچے مرد و زن بوڑھے بڑے بار بشِ خش
شور غوغا غل غبار ابھیڑ بھکڑ چپقلش

بھر گئیں مال اور خریداروں سے بازاریں تمام
جُٹ گئے دنیا کے جھگڑے میں غرض سب خاص و عام

فکرِ راحت فکرِ صحت فکرِ دنیا فکرِ دین
ایک دورے میں فلک اور ایک سختی میں زمیں

بیل کے مانند سب دن بھر تو کولھو میں چلے
شام کو آنکھیں کھلیں تو تھے اسی جا پر کھڑے

صبح سے کرتے رہے جی توڑ کر دن بھر تو کام
شام کو دیکھا تو تھا کل کی طرح پھر نا تمام

جب خیال آیا کہ پرسوں کیا ہوا کل کیا ہوا
کچھ تو نہیں سا یاد تھا بھولا ہوا بھٹکا ہوا

وہ گذشتہ وقت وہ گذرا ہوا شور و شغب
ہو گیا گہرے سمندر میں فنا کے غرق سب

ہر سحر کچھ پھول تازے اس گلستاں میں کھلے
اور سب دن بھر مہک کر شام کو مرجھا گئے

یوں ہی ہوتے اور گذرتے رہتے ہیں صبح اور شام
ایک دن آخر صدی ہو جاتی ہے پوری تمام

جس کو سب استحکام کہتے ہیں وہ اک آغاز ہے
موت کہتے ہیں جسے وہ صرف اک آغاز ہے

# نوبت رائے نظر لکھنوی[۱]

## سنتنا جی

جب گلشنِ جہاں میں کچھ تازگی سی آئی
غنچوں کے بھی لبوں پر کچھ کچھ ہنسی سی آئی
شاخوں میں نخلِ گل کی اک نازکی سی آئی
کاواک انجمن میں دلبستگی سی آئی

تب ساقیٔ ازل نے دے دے کے جامِ صافی
ہم وحشیوں کو بھیجا اپنا پیامِ صافی[۲]

پایا سبق جو ہم نے اخلاقِ بے ریا کا
تہذیب اور تمدن مذہب کا اور وفا کا
تھا موجزن سمندر اک صدق اور صفا کا
پُتلا بنا ہُوا تھا ہر آدمی حیا کا

تھا نازشِ دو عالم طرزِ عمل ہمارا
تاریکیوں میں رہبر نورِ ازل ہمارا

وہ دن کہاں گئے اب آئے آسماں پہ ہیں
سُنتے کبھی نہیں ہم وہ نغمہ ہائے شیریں
وہ نرمی وہ حلاوت وہ لطف پاتے بیٹھیں
وہ زیست کے کہاں اب سادے اصول و آئیں

دُنیا بھری ہوئی ہے آلائشوں سے یکسر
پڑتے ہیں تکلفوں سے زیبائشوں سے یکسر

آتے نہیں یہاں اب وہ ہادیٔ طریقت
طرزِ عمل تھا جن کا خود مشعلِ ہدایت
کو وہ الم اُٹھا کر سہہ سہہ کے رنج و کلفت
دیتے بشر کو ہر دم اک دائمی بشارت

دنیا کو پاک کرتے ظالم کی بدعتوں سے
ہر وقت کام اُن کو انساں کی راحتوں سے

---

۱؎ ادیب، الٰہ آباد۔ فروری ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۰۱ سے ۱۰۳ تک
۲؎ مراد از وید مقدس

تھیں دیویاں ہماری عفت مآب یکسر    پڑھتیں نماز حوریں دامن پہ جھکے آکر
جنت تھی جنکو ہر دم زیر قدم شوہر    وہ ہو فقیر کوئی یا شاہ ہفت کشور

یہ جانتیں اُسی کو یہ مانتیں اُسی کو
اپنا خدائے عالم گردانتیں اُسی کو

ان دیویوں میں سیتا سرمایۂ وفا تھیں    جو رام چندر جی کی بانوئے خوش ادا تھیں
شمع حریم دل تھیں خورشید پُر ضیا تھیں    باطن میں ایک تھیں وہ ظاہر میں گو جُدا تھیں

کاشانۂ جہاں میں تھے رام شعلۂ نُور
نُورِ ازل کی خاطر سیتا تھی شمع کا نور

دونوں کی ذات تھی دونوں جہاں کی رونق    یہ تھیں زمیں کی رونق وہ آسماں کی رونق
دونوں کے دم سے دونی کون و مکاں کی رونق    جس طرح بلبل و گل ہیں بوستاں کی رونق

دونوں ہی الغرض تھے چشم و چراغ عالم
فیضِ قدم سے جنکے جنت تھا باغِ عالم

سیتا کے عیش میں جب رخنہ فلک نے ڈالا    اور رام کو محل سے بن باس کے نکالا
رُخصت ہوا نظر سے گھر کا وہ سب اُجالا    دے دیکے ان کو تسکیں سب نے بہت سنبھالا

سائے کی طرح لیکن دنبال رام تھیں وہ
شامِ شبِ الم میں ماہِ تمام تھیں وہ

چھالوں کی خوں فشانی کوسوں وہ دشت پُرخار    زخمی تھے پائے نازک چلنا تھا سخت دشوار
شوہر کے ساتھ لیکن وہ دشت بھی تھا گلزار    راحت سے اسکی مطلب خدمت سے تھا سروکار

چہرہ تھا زرد لیکن دل میں شگفتگی تھی
ہر دم تھیں پیشِ شوہر اسکی بڑی خوشی تھی

صحرا میں رام و لچھمن پھرتے تھے با دلِ شاد    سیتا تھیں ساتھ خوش خوش آتی نہ گھر کی تھی یاد

بستی سے موڑ کر منہ جنگل کیا تھا آباد     بن باس کی غرض تھی چودہ برس کی میعاد
نیکی سے اُن کی ممنون جن بھی تھے اور بشر بھی
مانوس ہو گئے تھے جنگل کے جانور بھی

---

ناگاہ آنکھ کھولی سیتا نے غش سے ایکبار     دیکھا کہ بن کے بدلے پیدا یہاں ہے گلزار
جھلتی ہے مورچھل اک بدشکل اور مُردار     صدہا خواصیں ایسی صورت ہے جنکی خونخوار
تھیں بے طرح یہ ظالم گھیرے ہوئے جو شب سے
ہوتے ہی صبح بیٹھیں وہ دُور جا کے سب سے

زیر درخت روئیں جی کھول کر وہ یک چند     سیلاب چشم امنڈا پلکوں کا توڑ کر بند
اُس دل پہ بار غم ہے کل تک رہا جو خورسند     روتی تھیں چُپکے چُپکے شمع سحر کے مانند
پابند شرم تھیں وہ نفرت رہی فغاں سے
گھٹ گھٹ کے جان کھوتیں کہتیں نہ کچھ زباں سے

تھا رام رام لب پہ دل میں ہجوم غم تھا     فرقت میں آب و دانہ اُن کے لیئے قسم تھا
تھیں اک غزال رعنا غیر دل سے اُن کو رم تھا     بے ننگوں کا مجمع سب سے بڑا ستم تھا
دُوری سے رام کی تھے لاکھوں ملال اُن کو
آتے تھے کیسے کیسے ہر دم خیال اُن کو

---

سیتا کے پاس پہونچے اس قید میں ہنومان     یہ رام کے تھے قاصد سب مشکلیں تھیں آسان
بولے کہ ساتھ چلیئے آئے نہ دل میں کچھ دھیان     کہنے لگیں یہ سیتا مجھ کو ہے ایک ارمان
لنکا کو فتح کر کے لے جائیں رام مجھ کو
چلنے میں تھا تردد نہ کوئی کلام مجھ کو

آخر کو فوج راون میدان میں کام آئی
پھر بھی بہادری سے اس نے شکست کھائی

مشکل تھی موت اسکی لیکن امان نہ پائی
سیتا کو قیدِ غم سے فوراً ملی رہائی

زندان سے چھٹ کے آئیں جس دم وہ جانِ عصمت
لازم ہوا کہ پہلے دیں امتحانِ عصمت

دیکھا جو سمت شوہر پایا کبیدہ خاطر
اگلی سی وہ محبت چہرے سے تھی نہ ظاہر

ازبس مزاج داں تھیں اور رازِ دل سے ماہر
سمجھیں کہ بدگمانی لائی ہے رنگ آخر

عورت کی زندگی کیا شوہر جو بدگماں ہو
کہنے لگیں کہ فوراً اس شک کا امتحاں ہو

داخل ہوئیں چتا میں آخر وہ بے محابا
شعلوں سے آگ کے تھا آتشکدہ وہ صحرا

اس طرح آگ میں تھا روشن وہ روئے زیبا
خورشید ہو افق میں جس طرح عالم آرا

گردوں سے ہو رہی تھی دیوی پہ بارشِ گل
ہر لب پہ مدحِ سیتا ہر سمت تھا یہی غُل

جب آگ سے ہوا کچھ اُن کا نہ بال بیکا
پہونچا ثبوت کامل جب پاکدامنی کا

تب رام نے بھی بڑھ کر اُن کو گلے لگایا
عظمت ہوئی مسلّم آنکھوں پہ سب نے دی جا

لنکا کو فتح کر کے رام آئے جب وطن میں
آئی بہارِ رفتہ اُجڑے ہوئے چمن میں

# علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی

## آہِ سرد[1]

ایک دن میں اور شریکِ رنج و راحت ایک دوست — مہربان و مشفق و اخلاص مند و با صفا
ایک دل کہئے کہ یک رنگی کہ فرطِ اتحاد — اُسکے دل میں میں تھا میرے دل میں وہ جلوہ نما
آشکارا اُس پہ تھی جو بات میرے دل کی تھی — وہ زباں پر تھا مری جو کچھ کہ اسکے دل میں تھا
ایک کا دل ایک سے تھا صاف مثلِ آئینہ — ایک کا راز ایک سے مخفی نہ ہرگز تھا ذرا
اُس کی باتوں کو میں سمجھوں جھڑ رہے ہیں منہ سے پھول — گفتگو کو میری وہ سمجھے نسیم جاں فزا
ایک ٹھنڈی سانس نکلی دل سے میرے ناگہاں — ہو گیا بے چین سُن کر وہ رفیقِ با صفا
اور کہا اس طرح ٹھنڈی سانس تو نے تو بھری — جیسے ہوتا ہے کسی کے دل میں دردِ جاں گزا
ہنستے ہنستے کیوں مکدر ہو گیا تو ایک بار — باتیں کرتے کرتے آخر کیا تجھے یاد آ گیا
دل میں اکثر میرے آیا پوچھیے اس کا سبب — میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے تجھ کو دیکھا بارہا
کیا کوئی حسرت ہے، دل میں کیا کوئی غم ہے تجھے — اپنے ٹھنڈی سانس لینے کا سبب کچھ تو بتا
سُن کے میں نے ہمنشیں سے یہ محبت کا کلام — کھینچی ایک اور آہِ سرد اور یہ جواب اسکو دیا
یوں تو صدہا واقعے گذرے ہوا دل جن سے خون — مجھ کو یاد آیا نہیں اس وقت کوئی ماجرا
یوں تو لاکھوں حسرتیں پیدا ہوئیں اور مر گئیں — کوئی حسرت بھی نہیں اس وقت دل میں دیکھتا
درد سے یوں تو نہیں خالی کسی انسان کا دل — میرے دل میں تو نہ تھا اس وقت دردِ جاں گزا
غم کو گر پوچھو تو غم سہتے ہی سہتے کٹ گئی — لیکن اس وقت آتشِ غم سے تھا خالی دل مرا

[1] ادیب الہ آباد - جنوری سنہ ۱۹۱۰ء صفحہ ۴۹

کیا بتاؤں میں اس آہ سرد کا مشفق سبب
ٹھنڈی سانسیں بھرتے بھرتے ہو گئی عادت مجھے
سن کے یہ اس نے بھی کھینچی ایک دل سے آہ سرد
اب جو دیکھا وہ بشاشت تھی نہ حسن التفات
دیکھ کر افسردگی اسکی کہا دل نے میرے
چھوڑ دینا تو نہ ہاتھوں سے اگر دامان ضبط
تیرا دل خود تو مکدر رہتا مگر یہ تو سمجھ
کر دیا اپنی طرح سے اس کو بھی حسرت نصیب
ہاتھ سے دے دیجئے سر رشتۂ ضبط اس طرح
چاہیئے ہر دم بچانا اس ہوائے سرد سے
تو ہمیشہ رہنا ہے جیسی بد جیسی افسردہ دل
خود ہے اپنی جان سے بیزار تو انصاف کر
خود بنا رکھی ہے تو نے اپنے دل کی سی شکل
گر یہ خواہش ہے تیرے کام میں گتھی پڑے
دل میں جب تاریکی غم ہو تو ہر دم چاہیئے
چاہیئے اس طرح جانا محفل احباب میں
پھر مقدم کا اشارہ جھوم کر کرتی ہے شاخ
جس شجر کے پاس سے گذری لگا وہ جھومنے
دل پہ جو گذرے سے وہ گذرے کیوں کسی کو ہو خبر
گر زمانہ ہیش کا جاتا رہا مضطر نہ ہو
شادی و غم جبکہ دونوں ہیں جہاں میں بے ثبات

سچ اگر پوچھو تو مدت کا ہے دل دکھا ہوا
بے سبب بھی کھینچتا ہوں آہ سرد اب بارہا
اور فرمایا کہ حیدر یہ تو تو نے سچ کہا
ہو گیا اک دم میں وہ افسردہ دل حد سے سوا
آہ کر کیوں اس طرح جو سن لے کوئی دوسرا
کیوں پشیمانی کا ہوتا اس طرح سے سامنا
دل مکدر کر کے اک مشفق کا تجھ کو کیا ملا
کیا محبت اور مروت کا یہی تھا مقتضا
دوسرے کو ساتھ اپنے کیجئے یوں مبتلا
آدمی کا دل تو شیشے سے بھی نازک ہے سوا
پھر کسی کی بزم عشرت میں نہ جا بہر خدا
تجھ سے اہل بزم پھر کس طرح خوش ہونگے بھلا
پھر کسی سے کیا بھلا نکلے گا تیرا مدعا
ہے یہ لازم بل نہ آنے پائے تیوری پہ ذرا
روشنی رخ پر بشاشت کی تبسم کی ضیاء
باغ میں جس طرح خوش خوش آتی ہے باد صبا
اور چٹک کر دیتی ہیں کلیاں صدائے مرحبا
پہونچی جس غنچہ تک افسردہ تھا وہ ہنسنے لگا
سب سے بڑھ کر ہے خدا تو حال دل کا جانتا
غم کی آمد دیکھ کر پروانہ کر گھبرا نہ جا
وقت اپنا کاٹ دے ہنس بول کر مرد خدا

# محمد نوح - نوح - ناروی

## غزل[1]

شبنم کے ہر آنسو میں بات نرالی ہوتی ہے
فرشِ چمن پر قطرہ ہے برگ شجر پر موتی ہے

لمبی چوڑی راتوں میں دنیا چین سے سوتی ہے
میں قسمت کو روتا ہوں قسمت مجھ کو روتی ہے

ساون بھادوں کے بادل کالے کالے اٹھتے ہیں
زلف سیہ کی الفت میں وحشت مجھ کو ہوتی ہے

شرحِ مصیبت کرنے پر رنج اٹھا کر مرنے پر
حسن کی دنیا ہنستی ہے عشق کی دنیا روتی ہے

پاس نہ آئے دور رہے ظلم و ستم کی گرم ہوا
نخلِ وفا کے سائے میں حسرت میری سوتی ہے

صبر بہت دشوار طلب چاہ بڑی نا خیر پسند
آتے آتے آتا ہے ہوتے ہوتے ہوتی ہے

چند پجاری مل جل کر آئیں بھی چونکائیں بھی
عشق کے دلکش مندر میں حسن کی دیوی سوتی ہے

اس کا ڈر اس کا کھٹکا اس کا خوف اس کا دھڑکا
عشق کی اوگھٹ گھاٹی میں یکسوئی کب ہوتی ہے

شورِ قیامت ہی اٹھ کر جلد کہیں بیدار کرے
نالے پنکھا جھلتے ہیں قسمت میری سوتی ہے

خارِ تمنا تو نکلے لیکن اس کا باعث کیا
دل پہ ہاتھ جو رکھتا ہوں دل میں کھٹک سی ہوتی ہے

بحرِ ستم کے ساحل پر خونِ وفا کی موجوں میں
قاتل ہاتھ ڈبوتا ہے تیز چھری منہ دھوتی ہے

رنج و خوشی کے عالم میں دیکھا سارے عالم کو
آدھی دنیا ہنستی ہے آدھی دنیا روتی ہے

قہر کہوں یا حشر کہوں اور تو کوئی لفظ نہیں
دل جس میں مٹ جاتا ہے وہ ساعت کیا ہوتی ہے

دشتِ جنوں میں اہلِ جنوں کچھ نہ کہیں خاموش رہیں
صبحِ وطن کے چرچے پر شامِ غریبی روتی ہے

عقل و خرد سے مطلب کیا عشق و حسن کے مشرب کو
دل کے لینے دینے میں چھان پھٹک کب ہوتی ہے

وہ مجھ سے یہ کہتے ہیں ہار پہ اپنے گوندھوں گا
میں اُن سے یہ کہتا ہوں دل اُن بندھا موتی ہے

[1] جلوۂ یار - میرٹھ - ستمبر - اکتوبر ۱۹۲۲ء - صفحہ ۱۰۳

بہتے ہیں اشک آنکھوں سے ضبط فغاں میں کرتا ہوں ؎ رک جاتی ہے تیز ہوا زوروں کی بارش ہوتی ہے

اب طوفانِ محبت سے چھٹکارا ممکن ہی نہیں

کشتی بیچ سمندر میں مجھ کو لے کر ڈوبی ہے

---

# واصف حسین واصف اکبرآبادی

## ہلالِ عید

اے مہ عید بے مثال ہے تو ؎ سایۂ مہر ذوالجلال ہے تو

کشش کاف کن کا نقشہ ہے ؎ حسن آغاز کا مآل ہے تو

نیم گردش ہے چشم ساقی کی ؎ خطِ جام مئے وصال ہے تو

مست رفتار کا ہے نقشِ قدم ؎ حلقۂ دیدۂ غزال ہے تو

ہے تخیل کی صورت باریک ؎ ذہن شاعر کا انتقال ہے تو

لب اظہارِ مدعا کہیئے ؎ دہن تنگ مہ جمال ہے تو

ہے گریبان حور کا کنٹھا ؎ شکن دامنِ خیال ہے تو

خم محرابِ مسجد نبوی ؎ کشش ابروئے بلال ہے تو

شکل منقار عندلیباں ہے ؎ پر طاؤس کی مثال ہے تو

ہے تراشیدہ ناخنِ معشوق ؎ سر انگشت نونہال ہے تو

پیچ دستار چرخ اخضر کا ؎ شرح دیباچہ کمال ہے تو

حلقۂ گیسوئے شبِ معراج ؎ کھل گیا عقدہ محال ہے تو

بحرِ مواج حسن کی اک موج ؎ بانکی کج ادا کی چال ہے تو

ؔ ادیب الہ آباد۔ ستمبر ۱۹۱۲ء صفحات ۱۲۸ و ۱۲۹

مصرعۂ تر ہے طبع نازک کا — نقش رنگینیٔ خیال ہے تو
کیوں مہینہ کٹے نہ عیش کیساتھ — خنجر قاطع ملال ہے تو
بڑھ کے گھٹتا ہے گھٹ کے بڑھتا ہے — عین عبرت کی اک مثال ہے تو
اسکی قدرت کا اک نمونہ ہے — پرتو حسن لازوال ہے تو
کیوں نہ کھینچے دلوں کو اپنی طرف — کشش لام اقبال ہے تو
دور پرکار گردش دوراں — مرکز محور کمال ہے تو
کیوں نہ ہو آسماں پہ تیرا دماغ — ماہ شوال کا ہلال ہے تو

کیوں نہ دائم خوشی ہو آصف کو
عیش بے حد پہ عین وال ہے تو

---

**تمام شد**